قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۶۲۱۹

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاءُ الرحمٰن آرائیں

طابع : سید عبدالسلیم

مطبع : آفتاب عالم پریس

۱۳ ہسپتال روڈ، لاہور

فون۔ ۲۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۷ ——— فروری ۱۹۹۴ء ——— شمارہ ۲

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : -/۱۰ روپے

فہرستِ مضامین

لمعات	ادارہ	۲
کمپیوٹر کا اعلان	ادارہ	۹
۱۹ کے عدد کا چکر	ادارہ	۱۰
قرآنِ حکیم ریاضی کے کسی فارمولے کا محتاج نہیں۔	عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ	۱۵
دعوے کی صداقت	علی محمد چدھڑ	۲۷
عورت کی نصف گواہی	رحمت اللہ طارق	۳۲
تفکر و تدبر پرویزؒ	ثریا عندلیب	۳۶
دینِ واحد سے مختلف مذاہب تک	خان افضل آفریدی	۴۲
پاکستان کی اقتصادی بہتری کے تقاضے	حافظ محمد یعقوب	۵۴
توہینِ رسالت	حسین امیر فرہاد	۵۸
برائے نام	خان عالم	۶۲
نامے جو میرے نام آتے ہیں	ادارہ	۶۵
صبحِ قیامت	عمران احمد	۶۸
بچوں کے لئے	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۷۴
اعلاناتِ درس	ادارہ	۷۶
اقبال (انگریزی)	ایم۔ ایچ۔ رازی	۷۸
دیارِ غیر میں درسِ قرآن	ادارہ	۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مطالبۂ پاکستان صرف ایک خطۂ زمین کے حصول کا مطالبہ نہ تھا، یہ ایک نئے تصورِ قومیت پر مبنی معاشرے کی تشکیل اور حکومت کے قیام کا مطالبہ تھا ——— اس سے قبل قومیں رنگ کی بنا پر، نسل کی بنا پر، زبان کی بنا پر جغرافیائی حدود میں تقسیم انسانوں کے گروہ تھے ———

قیامِ پاکستان ایک تصورِ حیات، ایک آئیڈیل پر ایمان رکھنے والوں کا مطالبہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم اسلام پر ایمان رکھنے کے ناطے یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے ان اصولوں کے مطابق جو اسلام کا تقاضا ہیں ایک معاشرہ قائم کریں اور حکومت قائم کریں جن کے متعلق ہمارا منشور خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم ہماری رہنما ہے ——— اور یہ چونکہ ایک آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے اس لئے ہم ان خطوں کی آزادی چاہتے ہیں جہاں ہم واضح اکثریت میں ہیں۔

قائدِ اعظمؒ نے فروری ۴۸ء میں آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں ارشاد فرمایا۔

"مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونِ ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے:

ایسا، ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان مستقبل پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم نہ سمجھ سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل

بھی بیان کردوں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا:۔

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں، ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے اسالیبِ فکر، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں"۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، صـ۵۸)

افسوس کہ ہم آج تک اس آئیڈیل کی طرف قدم نہ بڑھا سکے جو قائد کا مقصود تھا۔

قائد کا مقصود کیا تھا اس کے متعلق ہم انہی کے الفاظ میں کچھ کہیں گے مگر اس سے پہلے ان وساوس کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اس قافلے کا قبلہ ہی تبدیل کر دینے پر تلے ہیں۔ منزل کا تعین ہو چکا ہو اور قافلہ بھٹک کر دوسری راہ چل نکلے تو مداوا ہو سکتا ہے، کوئی بھی صاحب رائے اٹھ کر کہہ سکتا ہے کہ راہے کہ تو می روی بہ مکہ نہ رسد ـــــ مگر جب منزل ہی دھندلا دی جائے تو قافلے کی سمت کیسے درست کی جا سکتی ہے۔ پہلے بھی کچھ کوششیں ہوتی رہیں مگر ایک نمایاں کوشش ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس صاحب نے بھی کتاب میں بھی کی یہ باور کرانے کے لئے کہ قائداعظم سیکولر طرزِ حکومت کے حامی تھے ـــــ اس کے بعد بھی یہ لوگ، لوگوں کے ذہنوں میں التباس پیدا کرنے کی ایسی کوششوں میں مصروف ہیں، تازہ ترین اس گروہ میں پرانے ولی خانی گروہ کے بزرگ، جو اس وقت وزیر اعظم صاحبہ کے سُسر بھی ہوتے ہیں ـــــ جناب حاکم علی زرداری بھی شامل ہو گئے، اپنے ایک بیان میں جو ہم پچھلے شمارے میں نقل کر چکے ہیں، انہوں نے یہی کچھ فرمایا ہے۔

مذہبی گروہ نے قائداعظم کی مغربی تعلیم اور بیک گراؤنڈ کے متعلق جو پراپیگنڈا کر رکھا ہے عام ناواقف لوگوں کو بھٹکا دینے کو وہی کافی ہے، عام لوگوں کو قائد کے دین کے متعلق فہم اور ان کے خیالات کا علم ہی نہیں، قائداعظم کے فرمودات کو نہ تو سرکاری طور پر مرتب کیا گیا اور نہ ہی قوم کی توجہ کسی اور ادارے یا تنظیم نے ان بکھری ہوئی تقاریر اور بیانات کی طرف مبذول کرائی۔ قوم کو ایک حد تک جان بوجھ کر قائد کے خیالات سے بے خبر رکھنے کی کوششیں کی جاتی رہیں، اس لئے کہ قائد کے خیالات ان تمام طبقات کے مفادات کی نفی کرتے ہیں جو آج تک اقتدار کے ایوانوں میں رہے یا ان ایوانوں کے خواب دیکھتے رہے، یہ لوگ جو یہاں کی سیاست کے اجارہ دار رہے ہیں، نواب، جاگیردار، وڈیرے، خان ـــــ نام مختلف سہی ایک ہی خاندان ایک ہی قبیلے کے افراد ہیں، یہ قبیلہ یہ خاندان، استحصالی خاندان ہے، انہی میں کارخانہ دار اور بیوروکریسی شامل ہو گئی اور انہیں مذہبی سائبان مہیا کیا

مذہبی حلقوں نے جنہیں ان لوگوں نے تقدس عطا کیا۔

چیف جسٹس صاحب کی باتوں کا جواب پرویزؒ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں دیا جو اس وقت "نوائے وقت" میں چھپا تھا۔ اس نے بہت سی غلط فہمیاں دور کیں، یہاں جو اقتباس دیئے جا رہے ہیں وہ اسی مضمون سے لئے گئے ہیں۔

سرمایہ دار طبقے کے خلاف قائداعظم کا وہ بیان دہرا دینا کافی ہوگا جو انہوں نے ۱۹۴۳ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے خاص اجلاس میں بطور صدر فرمایا۔

"اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا، تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

انھوں نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ ورکرز سے کلکتہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنی اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام و سہولت سے گزار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں۔ میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں کے لئے نہیں کر رہا میں یہ محنتِ شاقہ آپ غریبوں کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نے ملک میں دردانگیز مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔"

(حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ، ص ۳۵)

اور ان لوگوں کے متعلق جو خود کو مذہب کے اجارہ دار سمجھتے تھے (اور ہیں) انہوں نے ۵ فروری ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ کی یونیورسٹی کو خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا:۔

"مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں ..... رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس کھیل کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔"

(تقاریر قائداعظمؒ، حصہ اوّل، ص۴۸)

یہیں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ تھیاکریسی کے خلاف تھے۔

۱۱ اپریل ۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔ "اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں، ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے ــــ"

تھیاکریسی کے خلاف واشگاف الفاظ میں فرمایا:

"پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ امر مسلّمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔"

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص۶۵)

وہ تھیاکریٹک حکومت نہیں چاہتے تھے تو اس کا یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ وہ سیکولر حکومت بنانا چاہتے تھے ــــ

وہ کس قسم کی حکومت چاہتے تھے اس سلسلے میں ہمیں پھر قائداعظمؒ کے بیانات پر غور کرنا ہوگا۔ امریکہ کے نام پیغام ہی میں انہوں نے فرمایا تھا:

"مملکتِ پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگئی تھی ـــــ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے ـــــ"

یہاں قائداعظمؒ نے پاکستان کو سیکولر جمہوریہ نہیں کہا، اسلامک سٹیٹ کہا ہے۔ یاد رہے کہ یہ ذمہ دارانہ بیان ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کا ہے، جس بیان کا سہارا لے کر سیکولر کے حامی قائداعظمؒ کو اپنا ہمنوا ثابت کرنا چاہتے ہیں ـــــ اسلامی حکومت کے متعلق ان کا یہ فرمان بڑا واضح ہے۔

۱۹۴۱ء، عثمان یونیورسٹی، ایک سوال کے جواب میں فرمایا:۔

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست اور معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

(اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۸ فروری ۱۹۴۲ء)

قرآنِ پاک کے احکام اور اصول کا ذکر ہوا تو یہ بیان بھی پیشِ نظر رہے۔

۴۵ء میں ملت کے نام عید کے پیغام میں فرمایا:

"اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے رسول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:۔

"اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور

تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوتے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم، دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔"

(تقاریر، جلد دوم، ص۳۰۔)

اپنے امریکہ والے پیغام میں انہوں نے تھیاکریسی کی اصل و بنیاد کی طرف ایسا محکم اور واضح اشارہ کر دیا جس سے اس کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا ــــ "جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں ــــ"

بہتر ہوگا تھیاکریسی کی ذرا سی تشریح ہو جائے۔

"تھیاکریسی کا تصور تو پرانا ہے۔ لیکن اسے بطور نظامِ حکومت، عیسائی کلیسا (چرچ) نے یورپ میں رائج کیا۔ عیسائیت میں حکومت کا تصور تک نہیں۔ نہ ہی (مروجہ) انجیل میں قوانین دیئے گئے ہیں۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی حیثیت مشنریوں (مبلغین) سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ جب بعض بادشاہوں نے عیسائیت قبول کی تو پادریوں کے دل میں بھی جذبۂ اقتدار پرستی نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بادشاہوں سے سمجھوتہ کیا کہ احکام و قوانین کلیسا (چرچ) وضع کرے لیکن وہ نافذ حکومت کی طرف سے ہوں اور یہ سارا کاروبار خدا کے نام پر ہو۔ یعنی ان احکام و قوانین کو احکام خداوندی کہہ کر پکارا جائے اور انہیں نافذ کرنے والے حکمرانوں کو شریعت خداوندی کے محافظ قرار دیا جائے۔ اس سے ایک طرف مذہبی پیشوائیت کے جذبۂ اقتدار کی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا اور دوسری طرف، حکمرانوں کو مقبولیتِ عامہ حاصل ہو گئی کیونکہ عوام مذہب پرست تھے اور مذہب کے محافظ ان کے نزدیک خدائی اختیارات اور الوہیاتی احترام و تقدیس کے حامل (انگلستان کے بادشاہ یا ملکہ کو آج تک DEFENDER OF THE FAITH) کہہ کر پکارا جاتا ہے) ــــ مذہب اور حکومت کی اس ملی بھگت کو تھیاکریسی (یعنی حکومتِ خداوندی) سے تعبیر کیا گیا۔ اس نظامِ حکومت میں انسانیت ظلم و استبداد کے جہنم میں مبتلا رہی، اس کے تصور تک سے (ہمارا آپ کا ہی نہیں) ہلاکو اور چنگیز خاں تک کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ نوعِ انسان کی تاریخ میں، تھیاکریسی سے بدتر دور کبھی

نہیں آیا۔ ہلاکو اور چنگیز خاں کے دل میں شاید کبھی کھٹک پیدا ہو جاتی کہ ہم بے گناہوں پر کیوں ظلم کر رہے ہیں۔ لیکن جو ظلم و تشدد خدا کے نام پر برپا کیا جائے تو اس سے تو ظالم اور مستبد حکمران اطمینان ہی نہیں، فخر محسوس کرتا ہے کہ میں خدائی مشن پورا کر رہا ہوں۔

مختصر الفاظ میں تھیاکریسی سے مراد ایسا نظامِ حکومت جس میں انسانوں کے وضع کردہ احکام و قوانین کو احکامِ خداوندی کہہ کر نافذ کیا جائے اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر حوالہ دار و رسن کر دیا جائے۔ ان مظالم کی بنا پر تھیاکریسی کے خلاف جو ردِ عمل ہوا اسے سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے حامیوں نے کہا کہ مذہب کو مملکت اور حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب کا دائرہ گرجا کی چار دیواری تک محدود ہے۔ مملکت کے معاملات، قوم کی منشاء کے مطابق کسی قسم کی حدود و قیود کے بغیر آزادانہ طے پائیں گے۔ انہوں نے مذہب کے لبادہ کے ساتھ اخلاقی اقدار و اصول کی "صدری" کو بھی اتار کر دور پھینک دیا۔ یہ ہے سیکولر نظامِ حکومت جس میں قانون سازی کے کلی اختیارات کسی قسم کی حدود و شرائط کے بغیر قوم (انسانوں) کو حاصل ہوتے ہیں۔

اس وقت یہ نظامِ حکومت (کم و بیش) ساری دنیا میں رائج ہے۔ (اور ساری دنیا اس کے ہاتھوں نالاں بھی ہے)۔"

ظاہر ہے اسلامک سٹیٹ میں کوئی کافرانہ نظام نافذ نہیں ہو سکتا یا جس حکومت میں کوئی کافرانہ نظام نافذ ہو اسے اسلامک سٹیٹ نہیں کہہ سکتے۔

قائداعظمؒ پہ سیکولرازم کے حمایتی ہونے کا الزام دھرنے والے دراصل وہ بے خبر لوگ ہیں جو نہ سیکولرازم کے مضمرات کو سمجھتے ہیں اور اسلامی نظام کے تصور سے یکسر بے بہرہ ہیں۔ ہمارا مشورہ یہی ہے کہ یہ لوگ زیادہ نہیں تو کم از کم قائداعظمؒ کے مختلف بیانات و تقاریر اور بطور گورنر جنرل بیانات پر پوری طرح غور کریں۔ ۱۹۴۷ء کی خاص حالات کے ماتحت کی گئی تقریر کو کھینچ تان کر اپنے مقصد کے لئے استعمال نہ کریں۔ قائداعظمؒ نے اس سے پہلے بھی بہت سی تقاریر کیں اور اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو کھل کر بیان کیا ہے، ان میں سے چند کی نشاندہی ہم نے کر دی ہے جو ان کے اس مفروضے کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہے کہ وہ پاکستان میں سیکولرازم نافذ کرنا چاہتے تھے۔

کمپوٹر کا اعلان

طلوعِ اسلام کے جنوری ۹۴ء کے شمارہ میں "کمپوٹر کا اعلان" کے عنوان سے مسٹر راشد خلیفہ کے مضمون کا اُردو ترجمہ آپ نے پڑھا اور اس کے متعلق جو کلمات ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے لکھے وہ ان کے ذاتی تاثرات تھے ادارہ طلوعِ اسلام اپنی رائے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ تصویر کا ایک رُخ تھا۔ تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرنے سے پہلے ہم نے ضروری سمجھا کہ راشد خلیفہ کا پورے کا پورا مضمون قابلِ فہم زبان میں قارئین کے سامنے لایا جائے ـــــ یہ جملہ آپ نے اکثر سُنا ہوگا کہ

COMMON PEOPLE READ THE LINES OF A NEWS PAPER

THE INTELLIGENT ONES READ BETWEEN THE LINES.

دانشوروں نے اسے کیسا پایا، اس کی ایک جھلک ماہنامہ طلوعِ اسلام ہی کے جنوری ۸۰ء کے شمارہ میں شائع ہونے والے تبصرہ سے ظاہر ہے جسے قارئین طلوعِ اسلام کے استفادہ کے لئے ایک بار پھر موجودہ اشاعت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ معروف قانون دان جناب عبداللہ ثانی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں قرآن کے خلاف اس نئی سازش کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کا مضمون بعنوان "کمپوٹر کا اعلان" اسی اشاعت میں شامل ہے۔ دوسرے قارئین موضوع زیرِ بحث کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہیں تو طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر ہیں۔

(ایڈیٹر)

یادش بخیر، مجلہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۸۰ء سے اقتباس

قرآنِ مجید

اور (۱۹) کے عدد کا چکّر

کچھ عرصہ ہوا بعض احباب نے ہمیں لکھا کہ کوئی صاحب امریکہ میں بیٹھے نہایت سادگی و پُرکاری سے قرآنِ مجید کے خلاف ایک سازش پھیلا رہے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے حروف کی تعداد (۱۹) ہے۔ قرآن مجید کی مختلف آیات اور الفاظ کو یوں جمع اور تقسیم کیا جائے تو اس کا حاصل (۱۹) آتا ہے۔ یہ ریاضیاتی فارمولا قرآنِ مجید کا معجزہ ہے اور اس کے عام کرنے کی اشد ضرورت۔ ہم نے اس وقت اس جاہلانہ مغالطہ آفرینی کو چنداں درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور مستفسرین کو انفرادی طور پر لکھ دیا کہ قرآن مجید انسانی راہ نمائی عطا کرتا ہے اور یہی اس کا معجزہ ہے۔ اسی اعتبار سے وہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس قسم کی ریاضی شعبدہ بازی کو اگر کسی کتاب کے الہامی (یعنی وحی) ہونے کا ثبوت تسلیم کر لیا جائے تو معلوم کتنی انسانی تصانیف اس زمرہ میں شامل ہو جائیں۔ لہٰذا، ہمیں اس فریب دہی سے محتاط رہنا چاہیئے۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں ہمیں یکے بعد دیگرے لٹریچر موصول ہونا شروع ہو گیا جس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ پراپیگنڈہ کی کوئی خاص مہم ہے اور قرآنِ مجید کے خلاف گہری سازش۔ اس لئے اسے بے نقاب کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس باب میں تفصیلی طور پر لکھنے کا سوچ رہے تھے کہ حسنِ اتفاق سے ہمارے سامنے، ماہ نامہ فکر و نظر، کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۸۰ء میں محترم عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا ایک مختصر لیکن جامع مقالہ آیا جو اس موضوع پر اچھی روشنی ڈالتا ہے۔ اسے ہم (ہاشمی صاحب اور ماہ نامہ مذکور کے شکریہ کے ساتھ) درجِ ذیل کرتے ہیں۔ سردست ہم اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اگر ضرورت ہوئی تو اس کی مزید وضاحت بھی کر دی جائے گی۔

ہاشمی صاحب نے پہلے سیکرٹری ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ کے نام ایک خط لکھا ہے اور اس کے بعد اپنا مقالہ۔ اس خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"قرآنِ مجید اپنی فصاحت و بلاغت، ہدایات و ہمہ گیری کی وجہ سے معجزہ ہے۔ کسی

ریاضیاتی نظم یا بنیاد کی بنا پر معجزہ نہیں ہے۔ کافروں کو جب قرآن مجید نے چیلنج کیا تو اس مطلب یہ نہ تھا کہ ایسی ہی ریاضیاتی بنیاد پر ایک یا دس سورہ بنا لاؤ۔ اور نہ یہ بات قابلِ قبول ہے کہ قرآن کا یہ کمال نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا اور نہ صحابہ کرامؓ کو۔

یہ (۱۹) کا عدد قدیم دیومالا میں مقدس تھا کہ اس میں عددِ اوّل یعنی (۱) اور سب سے بڑی اکائی (۹) شامل ہے۔ اس کو مدعیٔ نبوت باب خرمی مقتول ۲۲۳ھ اور اس کے ساتھیوں نے پھیلایا۔ پھر پچھلی صدی میں بہاء اللہ مرزا حسین علی نوری نے اسے تقدس عطا کیا۔ اب بہائیوں نے اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں یہ بات امریکہ سے پھیلائی ہے۔

لوگ عجائبات پسند ہوتے ہیں۔ یہودی (۷) و (۱۲) کو مقدس کہتے ہیں، عیسائی (۱۳) کو منحوس سمجھتے ہیں اور خود مسلمانوں میں پورا نظامِ اعداد منحوسہ متحابہ، اعدادِ متباغضہ کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ قمر در عقرب، پنجک، رجال الغیب، سفر چہار شنبہ منحوس اور نہ جانے اور کتنے ہی اوہام پیدا ہو چکے ہیں۔ اب اس نئی مہم کی اشاعت سے ایک مزید واہمہ پیدا کرنے کے سوا اور کیا فائدہ ہوگا۔

دعا ہے کہ اللہ ہم کو اور آپ کو بھی اوہام سے بچائے۔

اس کے بعد ان کا مقالہ سامنے آتا ہے جس کا عنوان ہے "قرآنِ مجید اور عدد (۱۹)۔" وہ درج ذیل ہے:۔

"کوئی سال ڈیڑھ سال سے کئی کتابچے اور اشتہارات مجھے اس مضمون کے بھیجے گئے ہیں کہ قرآنِ مجید میں (۱۹) کے عدد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کمپیوٹر کے ذریعہ مختلف حروف کی تعداد کو جمع اور ضرب کے عمل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ سب (۱۹) کے گرد گھومتے ہیں اور یہی قرآنِ مجید کی ریاضیاتی بنیاد ہے۔ ریاضیاتی بنیاد قرآنِ مجید کا معجزہ ہے اور کتاب اللہ کے الہامی ہونے کی دلیل ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں کمپیوٹر کے ذریعہ اس کی تحقیق کی گئی ہے اور وہیں سے اسے پھیلایا جا رہا ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ معجزہ پچھلے چند سال کے اندر ظاہر ہوا ہے جو پہلے کسی کو معلوم نہ تھا۔

اس تحقیق کی بنیاد اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کی سورہ المدثّر کی آیت (۳۰) (۷۴/۳۰) میں جہنم پر متعین فرشتوں کی تعداد (۱۹) بتائی ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں حروف کی تعداد (۱۹) ہے۔ اس کے بعد مختلف حروف کی تعداد کو (۱۹) یا (۱۹) کا حاصل ضرب ثابت کر کے یہ تاثر پیدا کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کا ایک ریاضیاتی نظام ہے اور وہ نظام (۱۹) کے

عدد پر قائم ہے۔

اس سلسلہ میں جتنے اشتہارات اور کتابچے ملے ہیں نے انہیں بہت غور کے ساتھ بار بار پڑھا، سب سے پہلے دو سوالات ذہن میں آئے۔ اوّل یہ کہ قرآن مجید میں تو اور بہت سے اعداد مختلف آیات میں مذکور ہیں۔ ۱۔۲۔۳۔۴۔۵۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۰۔۱۱۔۱۲ اور اسی طرح ۱۹۔۲۰۔۳۰۔۴۰۔سو۔ ہزار سب ہی مذکور ہیں۔ فرشتوں کی تعداد بھی سورۃ الحاقۃ آیت ۱۷ (۶۹/۱۷) میں حاملانِ عرش کی آٹھ بتائی گئی ہے۔ پھر صرف (۱۹) کے عدد ہی کو کیوں ریاضیاتی بنیاد بتایا جا رہا ہے۔ کیا اس عدد سے کسی کی عقیدت وابستہ ہے؟

دوم یہ کہ جن لوگوں نے امریکہ سے یہ آواز اٹھائی ہے وہ کون لوگ ہیں؟

اس سے قبل کہ اس نظریہ کی عقلی و علمی تحلیل کی جائے ان دونوں سوالوں کا حل کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

۱۔ دنیا کے مختلف علم الاصنام (میتھالوجی) میں اعداد کے اثرات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں بھی چیرو وغیرہ کی تصنیفات علم الاعداد کے اثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسکندریہ اور شام سے جب ماقبل الاسلام کے بت پرستانہ اوہام مسلمانوں میں پھیلے تو یہ افکار مسلمانوں میں آ گئے۔ یہاں تک کہ (۷۸۶) کا عدد بجائے بسم اللہ استعمال ہونے لگا اور آہستہ آہستہ یہ واہمہ اتنی ترقی کر گیا کہ قرآن مجید کی ہر سورہ اور ہر آیت آ کے اعدادِ جمل تیار ہوئے اور ان سے تعویذوں کا کام اب بھی لیا جاتا ہے۔ (۱۹) کا عدد سب سے بڑی اکائی اور اوّلین عدد (۱) کا مرکب ہے۔ اس سے بڑی بڑی کرامات لوگوں نے وابستہ کی ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں نے ان اوہام کو کبھی قبول نہیں کیا مگر جاہل عوام چالاک پیشواؤں کے پھندوں میں کچھ نہ کچھ پھنستے رہے اور آج بھی بہت سے لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔

۲۔ اس وقت جو (۱۹) کی اہمیت قرآن مجید میں ثابت کی جا رہی ہے وہ بہائیوں کی تبلیغی مساعی کی پیداوار ہے۔ کئی ہزار بہائی امریکہ میں رہتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں (۱۹) کا عدد پوری کائنات کا بنیادی عدد ہے۔ اس پر سارا جہان قائم ہے۔ انہوں نے حسابی مغالطہ دے کر مسلمانوں کو متاثر کرنے کی ایک جدوجہد کے طور پر شروع کیا ہے اور ہر زبان میں اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔

عدد (۱۹) کی برتری کا عقیدہ انہوں نے اس طرح قائم کیا ہے کہ بابی مذہب کا بانی علی محمد باب

۱۸۱۹ء میں شیراز کے شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور ۱۹۵۰ء میں اُسے بجرم بغاوت پھانسی دی گئی۔ ان کے ماننے والے تین فرقوں میں بٹ گئے۔ بابی[1] اصلی بہار اللہ مرزا حسین علی نوری کے پیرو بہائی اور اس کے بڑے بھائی یحییٰ نوری نورِ ازل کے پیرو ازلی، علی محمد باب نے قرآن مجید کے مقابلہ میں ایک کتاب "البیان" بھی لکھی ہے۔ اور بہار اللہ نے بھی ایک کتاب "الاقدس" تیار کی ہے جسے بہائی قرآنِ مجید کے برابر الہامی مانتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں علی محمد باب ظہورِ الٰہی تھا۔ اس کا سالِ پیدائش ۱۸۱۹ء ہے اور اس کو جمع کیجئے تو (۱۹) کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ (۹+۱+۸+۱ = ۱۹) اس عقیدہ کے بعد ساری کائنات کی ریاضیاتی بنیاد (۱۹) کو قرار دیا گیا۔ بہائیوں کی مذہبی تقویم میں ۱۹، ۱۹ دن کے ۱۹ مہینے ہوتے ہیں۔ ۱۹×۱۹ = ۳۶۱۔ شمسی سال کے باقی چار دن کو سال کے ایامِ متفرقہ قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح ۳۶۵ دن پورے کر لئے گئے۔ ازلی فرقہ تو یحییٰ نور ازلی کے جلد ہی وفات پا جانے کے بعد کچھ پھل پھول نہ سکا، لیکن بہائی خوب پھلے پھولے۔ بہار اللہ اور اس کے بعد عبد البہار پھر عباس آفندی اور اس کے بعد شوقی ایک دوسرے کے بعد مہدی اور ملہم ہوتے رہے۔ دولتِ اسرائیل ان کی سرپرست ہے اور فلسطین میں مقام عکہ ان کا صدر مقام ہے۔ یہ لوگ جگہ جگہ اپنا تبلیغی مرکز "بہائی ہال" بناتے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ مگر خفیہ طور پر اپنا کام کرتے ہیں۔ آگرہ اور دہلی میں ان کے مراکز ہیں۔ کراچی میں بزنس ریکارڈر روڈ پر ان کا بہائی ہال ہے۔ ہر جگہ دیواروں پر (۱۹) کا عدد لکھا ہوتا ہے۔ ہر تحریر کو (۱۹) سے شروع کرتے ہیں اور ہر شہ نشین پر (۱۹) کا عدد نمایاں طور پر لکھا جاتا ہے۔

اوپر کی تحریر و تحلیل سے ہم ان دو سوالوں کے جواب تو پا لیتے ہیں کہ عدد (۱۹) کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے اور کون لوگ اس مہم کو چلا رہے ہیں۔ رہا اس پورے نظریہ کا علمی جائزہ تو اس کے لئے کسی طویل تحریر کی ضرورت نہیں۔ ذرا غور کیجئے تو اس نظریہ میں پنہاں جہالت اور مغالطہ کھل کر سامنے آجائے گا۔

---

[1] یہاں کچھ سہوِ کتابت معلوم ہوتا ہے۔ شاید اصلی عبارت یوں ہو۔ "علی محمد باب کے پیرو بابی، اس کے جانشین بہار اللہ مرزا حسین علی نوری کے پیرو بہائی اور یحییٰ نوری کے پیرو ازلی۔" (طلوعِ اسلام)

۱۔ اگر کسی کتاب میں کوئی عدد، حرف یا اعراب یکساں ٹوٹے تو کیا ایسا ہونا کتاب کو الہامی ثابت کرتا ہے؟ اگر چاول کا رنگ سفید ہے تو بھی یہ بات زمین کے کروی ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے؟ یہ معیار کس نے قائم کیا اور دعویٰ و دلیل کے مابین منطقی تعلق کیا ہے؟

۲۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے حروف خاص طرزِ کتابت کی وجہ سے (۱۹) نظر آتے ہیں ورنہ اصلاً (۲۱) ہیں۔ باسم اللہ الرحمان الرحیم۔ اس میں اسم کا الف نہیں لکھا جاتا اور رحمان اصل میں فعلان کے وزن پر سعدان، غفران، حیران وغیرہ کی طرح رحمان ہے۔ خود قرآنِ مجید کی پہلی وحی میں "اقرا باسم ربک" موجود ہے۔ "سبح باسم ربک" موجود ہے۔ سب جگہ الف لکھا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید آسمان سے تحریری شکل میں نازل نہیں ہوا تھا اس لئے اس کے رسم الخط سے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔

۳۔ سورۃ الاعراف میں بسطہ پر ص آواز میں عدنانی قبائل کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے بنا دیا جاتا ہے۔ ورنہ عربی زبان میں بصط کوئی مادہ ہی نہیں۔ یہ استدلال محض نادانی اور جہالت کا کرشمہ ہے۔

۴۔ اس طرح جمع، تفریق اور ضرب و تقسیم کر کے بیسیوں عددی عجائبات قرآنِ مجید میں بلکہ معمولی انسانی تصانیف میں پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حٰمٓ کے اعداد جمل (۴۸) کو سورہ الحاقہ میں بیان کئے ہوئے عدد یعنی (۸) پر تقسیم کیا جائے تو (۶) کا عدد برآمد ہوگا اور الٓمٓ (۶) سورتوں کے اوائل میں ہے۔ قرآنِ مجید میں (۲۹) سورتوں پر (۱۴) حروفِ تہجی بطور حروف مقطعات موجود ہیں اور یہ (۱۴) گروپ ہیں۔ ۱۴×۱۴=۱۹۶ اور اس عدد کو اصحابِ کہف کے عدد (۷) پر تقسیم کیجئے تو چاند کے (۲۸) لمعات کا عدد ہو جائے گا۔ اس طرح جتنے عجائبات عددی چاہیں کسی کتاب سے نکال سکتے ہیں[1]۔ کتنی دلچسپ ابلہ فریبی ہے کہ اس قسم کے حسابی اور عددی عجائبات کو قرآنِ مجید کے معجزہ یا وحی آسمانی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے۔ انسان طبعاً عجوبہ پسند ہوتا ہے اس لئے اچھے خاصے ذی ہوش اور تعلیمیافتہ لوگ بھی ایسی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ابلہ فریبی کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ خدا ہم سب کو وہم سے بچائے اور بہائیوں کے اس چکر سے محفوظ رکھے۔"

[1] عربی زبان کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ فیضی نے عربی زبان میں قرآنِ مجید کی ایک ایسی ضخیم تفسیر لکھی ہے جس میں ایک حرف بھی ایسا نہیں آیا جس پر نقطہ ہو۔ کیا اسے بھی "الہامی" سمجھا جائے گا۔

عبداللہ ثانی پشاور

کمپیوٹر کا اعلان

(قرآنِ حکیم ریاضی کے کسی فارمولے کا محتاج نہیں)

یہ غالباً دس بارہ سال قبل کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے کمپیوٹر کے ذریعے انیس 19 کے ہندسہ کو قرآن کا اعجازی ہندسہ قرار دیا۔ یہ شاخسانہ چونکہ ایک خبر کی صورت میں سامنے آیا تھا اس لئے بعض قارئین اس کی اصل حقیقت نہ جان سکے۔ ماہنامہ طلوعِ اسلام نے اپنی جنوری ۱۹۹۴ء کی اشاعت میں اس مضمون کا اردو تلخیص شائع کیا ہے۔ قارئین طلوعِ اسلام اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ماہنامہ طلوعِ اسلام اسے پہلے ہی یہودی سازش قرار دے کر اس کوشش کی مذمت کر چکا ہے۔ جواب میں طلوعِ اسلام کا سابقہ تبصرہ دہرا دینا کافی ہوتا لیکن یہ شاخسانہ اب چونکہ تفصیل سے سامنے آیا ہے اس لئے بہتر ہوگا کہ اس کا جائزہ بھی اسی انداز سے لیا جائے۔

قرآنِ کریم کا اس سے بڑھ کر اور کیا اعجاز ہو سکتا ہے کہ یہ وہی کتابِ عظیم ہے جو حضورؐ پر نازل ہوئی اور بذریعہ وحی انہوںؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے کتابی شکل دی اور آج تک اس کے کسی حرف، لفظ حتّٰی کہ ایک شوشہ میں بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی اور نہ ہی اس کے بنائے ہوئے اصولوں میں کوئی فرق آیا ہے۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ (۶/۳۴)

قوانینِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس کا قانون اٹل ہے۔ (تو اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ قوانین واقعی اٹل ہیں)۔

اب اگر یہ صرف عقیدے کی حد تک ماننے والی کتاب بنا دی جائے تو بات کسی اور طرف نکل جائے گی کیونکہ عقیدہ ہی ایک ایسی اصطلاح وضع کر دی گئی ہے جس کی بنیاد پر سینکڑوں غلط مفروضوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ہر قدم پر اصول توڑ دیئے جاتے ہیں۔ عددی گورکھ دھندے کی تفصیل ذرا آگے آئے گی کہ دراصل بات کیا ہے؟ مثلاً آج بھی عقل و فہم رکھنے والے کروڑوں ہندو (علم و بصیرت نہ ہو) مندروں میں اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو خدا

بنائے بیٹھے ہیں۔ یہ صرف عقیدہ ہے اس کا علم و بصیرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہندو تو ایک طرف کہ وہ بیچارے تو کافر ہیں، ہمارے ہاں کروڑوں مسلمان عقیدے کی بنیاد پر لیٹے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ حالانکہ کھڑا بت لیٹے بت سے بدرجہا بہتر ہے۔ ہندو بھینٹ چڑھاتے ہیں، ہم نذرانے دیتے ہیں۔ عقیدے ہی کی بنیاد پر خود مسلمان ایک دوسرے کو قتل کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے کتنی خوبصورتی سے اسے یوں بتایا۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝ (۴۷/۱۴)

مفہوم: (بات بڑی صاف اور سیدھی ہے) ایک شخص، خدا کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں، زندگی کے صاف اور سیدھے راستے پر آنکھیں کھول کر چلا جا رہا ہے۔ دوسرا شخص، محض اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے جس سے اس کی سوجھ بوجھ کی قوتیں اس طرح ماؤف ہو جاتی ہیں کہ وہ بھلے اور بُرے میں تمیز ہی نہیں کر سکتا، حتّٰی کہ ہر برائی اسے بھلائی بن کر دکھائی دیتی ہے ـــــ کیا یہ دونوں شخص کبھی برابر ہو سکتے ہیں؟

اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ فرعون کے حوالہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ۝ (۴۰/۳۷)

مفہوم: یہ تھی اس کی وہ ذہنیت جس کی وجہ سے فرعون کو ہر بُری بات، بھلی بن کر دکھائی دیتی تھی اور اسے صحیح راستے کی طرف آنے ہی نہیں دیتی تھی۔

یہ کچھ صرف عقیدے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی انسان کو اس کے قبیح اعمال بھی حسین نظر آنے لگتے ہیں جبکہ قرآنِ کریم بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ علی وجہ البصیرت ایمان لاؤ۔ ظاہر ہے جو ایمان علی وجہ البصیرت ہوگا وہ یقیناً عقیدے کے ایمان سے کہیں زیادہ مضبوط اور توانا ہوگا۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہم تیسری، چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے تو ہمیں حساب کے بعض گُر یاد کروائے جاتے تھے۔ (گُر دراصل ایک قانون ہی ہے جس میں کہیں بھی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی اور جسے عام طور پر فارمولا بھی کہا جاتا ہے)۔ اس وقت ہم ان گُروں کو ہرگز نہیں سمجھتے تھے۔ مثلاً حساب کے اساتذہ آتے ہی سوال کرتے۔ بتاؤ اگر کوئی چیز سولہ روپے من ہو تو ڈھائی سیر کی کیا قیمت ہوگی۔ (یاد رہے کہ اس وقت من کے چالیس سیر اور روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے)۔ ہم بغیر سوچے سمجھے گُر (یعنی عقیدے) کی بنیاد پر جواب دیتے کہ سولہ آنے۔ اگر کوئی سمجھدار لڑکا ہوتا تو وہ جواب دیتا۔ ایک روپیہ۔ پھر جب ہم بڑی جماعتوں میں آئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ گُر بنانے کا کیا طریقہ ہوتا

ہے اور علیٰ وجہ البصیرت ہم نہ صرف ایک من بلکہ ٹنوں کا حساب خود لگا سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور عددی مثال دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ خود میں نے اپنے بچوں کو آپس میں اس پر بات کرتے سُنا ہے اور ساتھ ہی ان کی تصحیح بھی کی ہے۔ مڈل اور میٹرک کی کلاسوں میں ہمیں امتحان کے لئے رول نمبر جاری کئے جاتے تھے۔ ہر طالب علم اپنے رول نمبر کے اعداد کو آپس میں جمع کرتا۔ حاصل جمع کو رول نمبر پر تقسیم کرتا۔ اگر حاصلِ تقسیم طاق ہندسے میں ہوتا تو خود کو فیل تصوّر کرتا اور اگر جفت میں ہوتا تو خود کو پاس تصوّر کرتا یا کبھی کبھی اس کے برعکس تصوّر کرتا۔ بعد میں جب ہم بڑی جماعتوں میں پہنچے تو خود ہی اپنی ان حرکتوں پر ہنسی آنے لگی۔ حالانکہ یہ سلسلہ آج تک طلبا میں جاری ہے۔ طاق اور جفت کو سامنے رکھ کر ایک اصطلاح وضع کی گئی کہ

اَللّٰہُ وِتْرٌ وَّ یُحِبُّ وِتْرٌ

خدا طاق ہے اور طاق ہندسے کو پسند کرتا ہے

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کسی حساب کتاب یا کسی حسابی اعداد و شمار سے انکار کرتا ہوں۔ کیونکہ کائنات کا سارا نظام ایک حساب اور قاعدے کے مطابق رواں دواں ہے جس کا ذکر خود قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر موجود ہے۔ مثلاً

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵/۵)

سورج اور چاند جیسے عظیم کرّے ایک مقررہ حساب اور اندازے کے مطابق چل رہے ہیں۔

ذرا ہندسوں کے اس گورکھ دھندے کو پرکھیں اور یہ دیکھیں کہ اس کے پیچھے کونسی قوت ہوتی ہے اور وہ اپنا کتنا اثر دکھاتی ہے ــــ یہود و نصاریٰ ہماری مذہبی کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ ہمیں مصروف رکھنے کے لئے ضرور ایسے ایسے معجزوں سے ہمیں آگاہ رکھتے ہیں جن کا عام طور پر ہمیں علم نہیں ہوتا۔ مثلاً فی الحال ایک دو مثالوں سے بات آگے بڑھانا چاہتا ہوں ــــ کچھ عرصہ (تقریباً تیس سال قبل) پورے ملک میں ایک خط گردش میں تھا۔ وہ خط خانہ کعبہ میں کسی کے خواب دیکھنے سے متعلق تھا جس میں توبہ کے دروازے بند ہونے والے تھے اس لئے لوگوں کو تاکید کی گئی تھی کہ مسجدوں کو آباد کرو۔ ہر شخص چالیس چالیس خطوط لکھ کر تقسیم کرتا نظر آرہا تھا۔ یہ معاملہ ختم ہوا تو پھر دس بارہ سال بعد افواہ پھیلی کہ قرآنِ کریم میں بال نکل رہے ہیں۔ مسجد میں ہر شخص قرآن کے صفحے پلٹا رہا ہوتا اور ایک دوسرے کو بالوں کے نکل آنے کی تعداد کی خوشخبری سناتا ــــ اب چونکہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے ــــ تو ظاہر ہے ــــ کمپیوٹرائزڈ عمل ہونا چاہیئے اور وہ انیس کے ہندسے کی شکل میں سامنے آیا

حالانکہ یہ بھی تقریباً دس بارہ سال پرانا حربہ ہے۔ اگر انیسویں صدی کے ابتدا میں اس ہندسے کا ظہور ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ شاید انیسویں صدی میں قیامت برپا ہو جائے گی۔ لیکن اچھا ہوا کہ اس ہندسے کا اظہار بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہو رہا ہے۔ اور اب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔ ورنہ ہم بھی فلپائن کے ان بھکشوؤں کی طرح ہو جاتے جو اپنا سب کچھ بیچ کر جنگلوں میں چلے گئے کہ ان کے ماہرینِ نجوم نے دنیا کی تباہی کی پیشگوئی کر دی تھی۔ پھر بعد میں وہ سیارہ اپنے مدار سے نکل کر کہیں اور چلا گیا جو شاید پچاس سال کے بعد پھر نمودار ہو اور دنیا کے ساتھ ٹکرا جائے۔ احمقوں نے اتنا نہ سوچا کہ اگر ستارے نے دنیا کے ساتھ ٹکرانا ہے تو پھر جن جنگلوں میں انہوں نے پناہ لی تھی وہ جنگل بھی تو اسی دنیا میں تھے ـــــ بات عقیدے کی نہیں بلکہ علم و بصیرت کی تھی۔ عقیدے میں جوش ہوتا ہے ـــــ دین میں ہوش ہوتا ہے۔

جہاں تک ہندسوں کے تبرک کا تعلق ہے تو آج بھی دنیا کی تین چوتھائی سے زائد آبادی سات کے عدد کو مقدس جانتی ہے۔ اس لئے کہ

دنیا میں سات عجائبات ہیں۔
رنگوں کی تعداد بھی سات ہے۔
ہفتے میں سات دن ہیں۔
سمندر بھی سات ہیں۔
سات آسمان ہیں اور سات ہی زمینیں ہیں۔
سات فضائی کرّے ہیں۔
موسیقی کے سات سُر ہیں۔

یہ کچھ دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے سوچا کہیں ہم پیچھے نہ رہ جائیں تو انہوں نے کہا۔

سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔
قرآن کی سات منزلیں ہیں۔
سات بُرج ہیں۔
سات جنتیں اور سات جہنم ہیں۔

چنانچہ مسلمانوں نے پھر سات کے ہندسے کو اتنا چڑھا دیا کہ دوسری اقوام نے توبہ بھلی سمجھی۔ مسلمانوں کو اگر کسی معاملے میں ایک بار چھیڑ دیا جائے تو پھر غیروں کو بھاگنے کا راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ انیس کا ہندسہ تو اتنے واضح طور پر شاید ہی قرآن میں ملے۔ البتہ سات کا ہندسہ کئی مقامات پر واضح طور پر پایا جاتا ہے۔ سورۃ فاتحہ کی آیات کی تعداد سات

ہے۔ سورۃ بقرہ کے تیسرے رکوع میں سات آسمانوں کا ذکر ہے۔ اسی سورت کی ۲۶۱ آیت میں سات بالیوں کا ذکر ہے کہ جب تم مال خرچ کرتے ہو تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ

جیسے ایک بیج کے دانے میں سات بالیاں۔

(چونکہ میں نے سات ہی کسی طور پر نکالنا ہے لہذا اس آیت کا نمبر ۲۶۱ ہے۔ اگر ۶ کو ۲ میں جمع کر دیا جائے اور پھر اس سے ایک منفی کر دیا جائے تو جواب سات آئے گا ـــــ دیکھا آپ نے کیسے میں سات لایا ہوں)۔ اسی سورت میں ۱۹۶ نمبر آیت میں حکم ہے کہ جب تم حج سے واپس آجاؤ تو سات روزے رکھو۔ سورۂ یوسف میں سات سبز خوشوں اور سات خشک خوشوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح اسی سورت میں سات موٹی گایوں اور سات دبلی پتلی گایوں کا ذکر ہے۔ اس کے آگے سات سال کے قحط کا ذکر ہے۔ پھر

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ (۱۵/۴۳)

یقیناً ان سب کے لئے تباہی اور بربادی کا جہنم ہے جس کے سات دروازے ہیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ (۱۵/۸۷)

اور ہم نے تمہیں دو میں سات عطا کئے اور ساتھ ہی قرآنِ عظیم۔

(یہاں ضرب دینے کی ضرورت پڑ گئی۔ سات کو دو سے ضرب دیجئے تو ماحصل چودہ آتا ہے۔ قرآن کریم میں چودہ سجدے ہیں ـــ دیکھا آپ نے جواب کیسے درست نکلا ـــ ذرا آگے دیکھئے)۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ (۲۳/۱۷)

ہم نے تمہارے اوپر سات اجرامِ فلکی پیدا کئے۔

سورۃ کہف میں، اصحابِ کہف کی تعداد سات تھی اور آٹھواں ان کا کتا تھا (۱۸/۲۲)۔

سورۂ لقمان کی آیت نمبر ۲۷۔

مفہوم:۔ اس کائنات کی وسعتوں اور قوانینِ خداوندی کی حدود فراموشیوں کا یہ عالم ہے کہ اگر تمام روئے زمین کے درخت قلم بن جائیں اور سات سمندر سب روشنائی میں تبدیل ہو جائیں تو بھی ان قوانین کا احاطہ نہ ہو سکے ـــ الخ

اب خدا ان تمام آیات کو ایک بار پھر دیکھیں۔ یہاں تک کہ کسی نہ کسی طور پر سات کا ہندسہ اس میں پایا جاتا ہے آیت نمبر ۴۳ کو ۳+۴ = ۷ کی نظر سے دیکھیں۔ اس سے اگلی آیت میں ۷ کا ہندسہ خود موجود ہے۔ اس کا نمبر ۱۷ ہے۔ اگلی سورت نمبر ۱۸ ہے لہذا ۸-۱ = ۷۔ یہ ہوئی نابات۔

سورہ لقمٰن کی آیت نمبر ۲۷ میں بھی ۷ کا ہندسہ موجود ہے۔ ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ سورہ حٰمٓ السجدہ کی آیت ۱۲ کچھ یوں ہے۔

"خدا نے سات آسمانوں کو دو مراحل میں پیدا کیا اور جس قانون کے مطابق ان کو چلنا تھا اس کی وحی ان کی طرف کر دی گئی"۔

یہاں بھی مجھے سات کو دو سے اس لئے ضرب دینا پڑے گی کہ قرآنِ کریم میں سجدوں کی تعداد چودہ ہے اور یہ آیت بھی سورۂ حٰمٓ سجدہ میں آئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سات کا ہندسہ بڑا ہی معنی خیز اور پُر اعجاز ہے۔ نیز میرا بھی مفید مطلب ہے ـــــ کم از کم واہ واہ کہلوانے کا حق ضرور رکھتا ہوں ـــــ ہے کوئی جو اس کی اس سے اعلیٰ تاویل کر سکے ـــــ

مزید آپ حیران ہوں گے کہ حٰمٓ السجدہ کو اگر حروفِ ابجد کے حساب سے گنا جائے تو اس کی تعداد ۳۱۵۰ بنتی ہے جو سات پر پورا پورا تقسیم بھی ہو سکتا ہے۔

۶۵/۱۲ میں ارشاد فرمایا کہ میں نے سات آسمان اور اس طرح سات زمینیں پیدا کی ہیں۔ (دونوں کو جمع کیجئے تو چودہ سجدے بن جائیں گے۔) ظاہر ہے آسمان اور زمینیں خدا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ اوپر کے پانچ کے ساتھ دو کو جمع کریں اور اوپر کے ۶ کے ساتھ ایک کو جمع کر دیں تو حاصلِ جمع سات آتا ہے۔ واہ وا ـــ کیا کہنے ـــ جزاك الله ـــ

قومِ عاد و ثمود پر آندھی سات دن تک چلتی رہی جس سے ان کا نام و نشان مٹ گیا (۶۹/۷) ـــــ پھر سات آگے۔

وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ (۷۸/۱۲)

اور تمہارے سر پر فضا کی پہنائیوں میں کیسے محکم اور مضبوط سات کُرّے پھیلا دیئے۔

(آپ خود بھی محنت کریں تو سورہ اور آیت کے نمبر میں آپ کو سات کا ہندسہ ضرور مل جائے گا)۔ آگے

ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝ (۶۹/۳۲)

پھر ایک لمبی زنجیر ہوگی جس میں سات کڑیاں ہوں گی اور وہاں سے اسے جکڑ دیا جائیگا۔

(اس میں بھی آپ ذرا محنت کریں تو سورہ نمبر اور آیت نمبر میں سات کا ہندسہ آ سکتا ہے۔ صرف ضرب کی ضرورت ہے)۔

سورہ الماعون قرآنِ کریم کی سورہ نمبر ۱۰۷ ہے جس میں سات آیات ہیں۔

غرض سات کے ہندسے کے پیچھے کوئی اور صاحب پڑ گیا تو میری سات گھنٹے کی اس محنت پر سات دن کی مشقت کے بعد سات مرتبہ پانی پھیر دے گا۔ حالانکہ قرآنِ کریم میں جہاں سات آیا ہے وہاں کئی مقامات پر اس سے

مراد کثرت ہے۔

اب ذرا سات کے ہندسے کو میں خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا غور فرمایئے۔ جس میں ایک لفظ کی بھی غلط بیانی نہیں ہے۔ میرے نام کے پہلے حصے کے سات حرف ہیں۔

میری تاریخ پیدائش ۲؍ مئی ۱۹۳۴ء ہے۔ مئی پانچواں مہینہ ہے اس میں دو جمع کر دیں جواب سات ہے۔ سن کا پہلا ہندسہ سات ہے۔ نو سے تین نکال کر ایک جمع کر دیں تو جواب سات ہے۔ میرے ہائیکورٹ کا سیریل نمبر ۱۹۳ ہے۔ ڈاک خانے کا بکس نمبر ۳۹۱ ہے۔ وہی ہندسہ ہے صرف ترتیب بدل دی گئی ہے۔ میرے دسویں کا رول نمبر ۱۷۰۰ تھا۔ پھر مجھے جب کالج میں داخلہ ملا تو رول نمبر ۲۵ تھا۔ جمع کریں تو سات۔ احباب کو اگر میرے پرانے فون نمبر یاد ہوں تو پہلا نمبر ۸۷۳۷ تھا۔ دوسرا ۲۴۰۷۷۷ اور اب موجودہ ۲۷۰۷۳۷ ہے۔ تینوں میں سات کا ہندسہ تین مرتبہ آیا ہے۔ میرے سپریم کورٹ کا نمبر ۹۲۰ ہے۔ یہاں منفی کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ غرض مجھ پر سات کا ہندسہ کچھ اس طرح سوار ہے کہ اگر میں اسے اپنے کاندھوں سے نیچے اتارنا بھی چاہوں تو اتار نہیں سکتا ہوں اور اگر کبھی ضرورت پڑی تو اس سے کشف و کرامات کا کام بھی لے سکتا ہوں۔

یہاں ایک اور دلچسپ حقیقت سے بھی آپ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تمام ہندسے اکثر مذاہب والوں نے اپنے لئے مخصوص کر لئے۔ سکھوں نے سوچا کہ ہمارے حصے میں بھی کوئی ہندسہ آنا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے پانچ "ک" ایجاد کئے۔ یعنی کنگھا، کچھا، کڑا، کرپان اور کیس۔ ان کی ہر مذہبی ضرورت یا اصطلاح سے پہلے ک کا حرف آتا ہے۔ یہ پانچ کی پانچ چیزیں ہر سکھ کے پاس ہوتی ہیں۔ (موجودہ نسل کو شاید اس کا زیادہ علم نہ ہو) ظاہر ہے کہ یہ ایک چیلنج تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے پانچ کے مقابلہ میں چہل کاف کی دعا ایجاد کر دی۔ اسے چہل ک اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں چالیس مرتبہ ک کا حرف آتا ہے اور یہ دعا عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف منسوب ہے جنہوں نے اس دعا کے ذریعہ گیارہ سال کی ڈوبی ہوئی کشتی کو نکالا تھا۔

کَفٰكَ ربك کم یکفیكَ ــــ الخ

مذہب اور دین کا یہی فرق ہے جسے سب سے پہلے پرویزؒ نے سمجھایا۔ مذہب میں عقیدے کو سب سے زیادہ دخل حاصل ہے جبکہ دین میں علم و بصیرت کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مذہب میں قرآن کمپیوٹر کی تصدیق چاہتا ہے جبکہ دین میں قرآن خود ایک بہت بڑی سچائی اور حقیقت ہے۔ مذہب میں آج کے دور میں کمپیوٹر کسوٹی ہے جبکہ دین میں خود قرآن [redacted] بڑی کسوٹی ہے۔

میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ [redacted] کیوں ہوتا ہے اور اس کے پیچھے کونسی طاقت کارفرما ہوتی ہے۔ پھر بعض ان مِٹ ہندسوں کا بھی ذکر کروں گا۔

آیئے اب ذرا بقول پرویزؒ اس لال بجھکڑ کے انیس[19] کے ہندسے کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ طلوع اسلام جنوری ۹۴ء کے صفحہ چالیس پر حروف کو انتہائی غلط طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ ان کی تعداد ہرگز ۷۶ نہیں بلکہ ۸۴ بنتی ہے۔ اس لئے کہ ربّك کو تین گنا گیا ہے جبکہ اس کی تعداد ۴ بنتی ہے۔ یعنی ر ب ب ك ـــــ اگر کسی حرف پر موجود شدّ کو دو شمار کیا جائے جیسا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں اللہ کو ا ل ل ہ اس لئے شمار کیا گیا ہے کہ ل پر شدّ ہے۔ اب یہ تو انصاف کی بات نہیں کہ کسی غلط مفروضے کو درست ثابت کرنے کے لئے ہر وقت اصول بدلنے پڑیں۔ اسی طرح صفحہ ۴۰ پر الّذی میں ل پر پھر شدّ موجود ہے۔ اس لئے اس لفظ میں پانچ حروف ہیں۔ غرض ذرا سی محنت کے بعد اس صفحے پر موجود الفاظ میں حروف کی تعداد چوراسی (چور ـــ اسی) کو ذرا ۱۹ پر تقسیم کریں۔ اسے کوئی لال بجھکڑ ہی تقسیم کر سکتا ہے کوئی اور نہیں ـــــ

صفحہ ۴۱ پر بھی تعداد ۲۸۵ کی بجائے ۳۱۰ بنتی ہے۔

مسٹر راشد خلیفہ (یہ خدا کا شکر ہے کہ کہیں خلیفہ راشد نہیں) نے قرآنی عربی اور عام عربی میں فرق کا بھی ذکر کیا ہے۔ قرآنی عربی میں لفظ الانسٰن کو اس طرز سے لکھا ہے۔ ہماری سمجھ سے یہ مفروضہ بالکل باہر ہے۔ اس وقت دنیا میں موجود کسی بھی قرآنِ کریم میں الانسٰن اس طرح نہیں لکھا گیا ہے بلکہ الانسان یوں لکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عربی سے یہ لفظ اُردو میں آیا ہے اور اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ پھر یہ لفظ پورے قرآن کریم میں پورے پچاس مقامات پر استعمال ہوا ہے اور کہیں بھی راشد خلیفہ صاحب کی طرز پر نہیں لکھا گیا ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے :-

جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔ اس کی بنیاد عقیدہ ہے اور عقیدے میں غلط چیز بھی ٹھیک نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض افراد "واہمہ" کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ قوتِ واہمہ ایک ایسی قوت ہے جس میں کوئی انسان دل میں ایک خیال فرض کر لیتا ہے اور اسے اپنے اوپر اتنا طاری کر دیتا ہے کہ پھر اسے حقیقت میں وہ شے اپنے فرضی تصور کے مطابق نظر آتی ہے۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے۔

دُور سے آنے والی ریل گاڑی کی آواز پر اگر آپ کان کریں اور اس کے ساتھ آہستہ آہستہ دل میں کچھ یوں گنگنائیں کہ "چل کلکتے چھ چھ پیسے" چل کلکتے چھ چھ پیسے" تو آپ بالکل یہی محسوس کریں گے کہ یہ تو یہی آواز ہے حالانکہ ایسا نہیں۔ پٹھان اسے اپنی زبان میں محسوس کرتا ہے اور یوں گنگناتا ہے۔ ورک دے کرمہ۔ ورک دے کرمہ ـــ اے گاڑی تم نے مجھے مسافر بنا دیا۔ مسافر بنا دیا۔ غرض گاڑی کی RYTHM اور آپ کا تصور ہم آغوش ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی کچھ گاڑی بھی کہہ رہی ہے۔

دوسری مثال :- فاختہ کی آواز پر کان دھریں، تو پٹھان کہتے ہیں کہ یہ گوگوشتو۔ گوگوشتو کا نعرہ غم سے بھرا لگاتی

ہے۔ پنجاب کا دیہاتی کہتا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینکا جا رہا تھا تو یہ منظر صرف فاختہ نے دیکھا تھا۔ اس وقت سے یہ چلا رہی ہے کہ "یوسف کھوہ، یوسف کھوہ" (پنجابی میں کھوہ کنوئیں کو کہتے ہیں)۔ اسی طرح جب ہم چھوٹے چھوٹے ہوا کرتے تھے تو سامنے چھائے ہوئے بادلوں میں اپنی خیالی تصویریں دیکھا کرتے تھے۔ کہیں اونٹوں کا قافلہ جا رہا ہوتا تھا اور کہیں شیر کھڑا نظر آتا ـــ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں تو ہم میں پختگی آگئی ہے۔ قرآن نے بڑھاپے کو بھی بچپن سے تشبیہ دی ہے ـــ (۱۶/۷۰)۔ پھر کبھی ہم کٹے ہوئے بینگن میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تلاش کرتے ہیں اور کبھی مرغی کے انڈے پر خدا لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔ کبھی درختوں پر پاکستان پاک کے نام کندہ پاتے ہیں اور کبھی مچھلی پر کلمہ ڈھونڈتے ہیں۔ یہ سب مناظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں ـــ دور جانے کی بات نہیں۔ پچھلے سال پاکستانی اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی کہ آرمسٹرانگ نے مصر میں ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ جب اس نے چاند پر قدم رکھا تو وہاں اذانوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بعد میں میری نظر سے اس کی تردید بھی گزری تھی۔ یہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے چاند میں کوئی ڈراما نہیں دیکھی ورنہ پھر کیا ہوتا ـــ دراصل ہم مسلمان تن آسان ہو گئے ہیں اور کسی آسان سے راستہ سے جنت میں گھسنا چاہتے ہیں۔ قومیں دین اپنانے سے بنتی ہیں مذہب کی بھول بھلیوں سے نہیں۔ اور نہ ہی معاذ اللہ قرآن کوئی وڈیو گیم ہے جسے کمپیوٹر میں ڈال دیا جائے اور پھر انیس کے ہندسہ کو معجزہ بنا دیا جائے۔ میں علم الاعداد پر بھی آگے روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ ذرا قانون پر بات ہو جائے۔

قانون میں اگر تبدیلی آجائے تو اُسے ہرگز قانون نہیں کہا جائے گا۔ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ قوانینِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی اور یہی خدا کی سنت ہے۔ یہ کسی صورت میں بھی انیس کا ہندسہ نہیں کہ جہاں ضرورت پڑے تو الفاظ کا ہیر پھیر کر کے جواب انیس لایا جائے۔

فیثا غورث کے نام سے کون واقف نہ ہوگا۔ اس کی پیدائش سے پہلے تکون کی شکل موجود تھی۔ اس قانون کو اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ کسی تکون میں قاعدے کا مربع اگر عمود کے مربعے کے ساتھ جمع کر دیا جائے تو حاصل جمع وتر کے مربعے کے برابر ہوگا۔ اب آپ چاہیں تو چھوٹی سے چھوٹی تکون بنا کر اس کا تجربہ کر سکتے ہیں اور چاہیں تو بڑی سے بڑی تکون بنا کر ـــ اسی طرح کسی بھی شکل میں تکون کے اندرونی زاویوں کی تعداد ۱۸۰ درجے ہوگی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کاغذ کے ایک پرزے پر تکون بنائیں تو اس کے زاویوں کی تعداد ۱۸۰ سے کم ہو اور پورے کرۂ ارض پر تکون بنائیں تو اس کی تعداد ۱۸۰ درجوں سے زیادہ ہو۔ یہ کہلاتے ہیں اصول یا قانون جس میں شکل پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ البتہ جواب وہی آئے گا۔ حالانکہ یہ بھی قرآن ہی کا دعویٰ ہے کہ اعداد و شمار بھی خدا کے مقرر کردہ ہیں۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے جس کا ذکر سورہ توبہ میں موجود ہے۔

یار لوگوں نے علم الاعداد پر کئی کتابیں لکھی ہیں جو اکثر و بیشتر ظنیات پر مبنی ہیں۔ اعداد کو کئی حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کچھ نوری ہیں، کچھ ناری ہیں، کچھ خاکی ہیں، کچھ فانی ہیں۔ غرض کیا کیا کچھ ہیں یہ سب مفروضے ہیں۔ البتہ میں آپ کو ایک ایسے عدد سے روشناس کرانا چاہتا ہوں جو غیر فانی ہے۔ وہ ہے ۹ کا عدد۔ اس عدد کو یہ کمال حاصل ہے کہ اسے آپ کسی بھی عدد سے ضرب دیں حاصل ضرب کا حاصل جمع ۹ ہوگا۔ اگر حاصل جمع ۹ نہیں آیا تو پھر آپ نے کہیں غلطی کی ہوگی۔ ۹ کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔

مثلاً ۹ × ۱ = ۹

۹ × ۲ = ۱۸ یعنی ۸ + ۱ = ۹

۹ × ۳ = ۲۷ یعنی ۷ + ۲ = ۹

۹ × ۴ = ۳۶ یعنی ۶ + ۳ = ۹

اس طرح بڑھتے جائیں۔ پھر آپ کوئی بھی بڑے سے بڑا عدد لکھ کر اسے ۹ سے ضرب دیں، تو حاصل جمع ۹ ہی ہوگا اور اگر کہیں حاصل ۹ سے زائد ہو تو اسے پھر آپس میں جمع کر دیں۔ مثلاً

۹ × ۴۱۵۶۳ = ۳۷۴۰۶۷۔ ۷ + ۶ + ۰ + ۴ + ۷ + ۳ = ۲۷ یعنی ۷ + ۲ = ۹

اسے کہتے ہیں اصول اور یہ میری طرف سے چیلنج ہے۔ اب اگر ۱۹ کو بھی کوئی برکت حاصل ہے تو وہ اس وجہ سے کہ اس کے دائیں طرف میرا ۹ موجود ہے۔ یہ ہوئی نابات۔

راشد خلیفہ صاحب نے عربی کا واحد جسے اردو میں ایک کہا جاتا ہے، کو حروفِ ابجد کے حساب سے ۱۹ کے کھاتہ میں ڈالا ہے اور لکھا ہے کہ خدا واحد ہے اس لئے اس کا مجموعہ انیس ہے۔ اب کون ان سے پوچھے کہ یہ اسمِ صفت ہے۔ جو خدا کی طرف منسوب ہے حالانکہ عربی اعداد و شمار میں ایک کو واحد کہتے ہیں۔ چونکہ خدا ایک ہے اس لئے اللہ واحدٌ کہا جاتا ہے۔ جبکہ خدا کا عربی میں اسمِ ذات اللہ ہے۔ اگر اس کا مجموعہ ۱۹ ہوتا، تو پھر کوئی قابلِ فہم بات ہوتی۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ دوسری طرف اگر عربی کے واحد میں اعداد کا مجموعہ ۱۹ ہے تو پھر اُردو کے ایک، فارسی کے یک، انگریزی کے ون، پنجابی کے اِک اور پشتو کے یوہ کی تعداد بھی ۱۹ ہونا چاہیئے تھی۔ اسی طرح اگر عربی کے اللہ، فارسی کے خدا، پشتو کے خدے، انگریزی کے GOD، ہندی اور سنسکرت کے رام، ایشور، پرماتما اور بھگوان کے حروف کی عددی تعداد بھی ۱۹ ہونا چاہیئے تھی۔ لیکن کسی صورت میں ایسا نہیں ہے۔ میں نے جو سات اور نو کے متعلق تحقیق کی ہے اسے کوئی رد کرے تو کیونکر۔ واہمہ کے ذریعے آنے والے جوابات کو صحیح ماننا ذہنی پختگی کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو تو یہ معجزہ لگ سکتا ہے، قرآن کے کسی طالب علم کو ہرگز نہیں۔

ہمارے ہاں وسائل کی کمی ہے ورنہ پی ایچ ڈی (Ph.D) کے بغیر بھی شاید ہم ذہنوں کو ہلا کر رکھ دیں۔ حالانکہ میرا ارادہ اتفاقاً فروری کے پرچہ میں چاند کے متعلق کچھ حساب کتاب لکھنے کا تھا کہ چاند کیسے طلوع و غروب ہوتا ہے۔ کسی بھی پہلی تاریخ کو ہفتے کا کون سا دن ہوگا۔ چاند کے مدار کا کیا سلسلہ ہے وغیرہ جس سے کم از کم رویت ہلال کمیٹی کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ہر شخص جیب میں یہ فارمولا رکھ سکے گا اور پورے ملک کا جواب ایک ہوگا۔ صحیح جواب ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ غلط کئی ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی انتہائی مصروفیت کی وجہ سے ایسا نہ کر پایا۔ اس میں تھوڑا سا کام باقی تھا کہ اوپر سے ہنگامی طور پر انیس کا معجزہ رونما ہوا۔

غرض یہ سب اٹکل پچو قسم کی لال بجھکڑ ٹائپ لوگوں کی اختراعات ہیں اور اس میں کوئی حقیقت نہیں، سوائے اس کے کہ لوگوں کی توجہ قرآنی تعلیمات سے ہٹا کر انہیں معجزات میں الجھا دیا جائے۔ اگر یہی حالت رہی تو پھر یہود و نصاریٰ یہاں تک کہ ہندو اور آتش پرست سب کے سب اپنی خواہشات کے مطابق کسی ہندسے کو فرض کر کے اپنی اپنی آسمانی کتابوں سے اعجاز ثابت کریں گے۔ حالانکہ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب سے معذرت خواہ ہوں کہ نہ جانے ان کو کیا سوجھی اور اس پر تکیہ کر بیٹھے۔ ان کے لئے تو یہ معجزہ سے کم نہ ہو البتہ ہمارے لئے یہ بچوں کے وڈیو گیم سے زیادہ نہیں۔ انہوں نے خراجِ تحسین کا بھی ایک نیا انداز اختیار کیا کہ جہاں تک مسٹر راشد خلیفہ Ph.D امام مسجد کے قرآنی انگریزی ترجمے کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب نے اسے معیاری نہیں سمجھا اور قارئین طلوعِ اسلام کو ان کے ترجمہ جو سادہ اور عام قسم کا ہے، سے خواہ مخواہ بددل کر دیا۔ حالانکہ روشنی جہاں سے نکلے سادہ ہو یا عام قسم کی، بہرحال روشنی ہے۔ راقم کو انگریزی ترجمے کے مطالعہ کا موقعہ نہیں مل سکا اس لئے کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ البتہ خلیفہ جی نے ہمارے محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب کو کمپیوٹر کی بھول بھلیوں میں ضرور ڈال دیا ہے۔

ملتِ اسلامیہ پہلے ہی سے کیا کم بھول بھلیوں میں مبتلا ہے، کہیں قرأت پر جھگڑا ہے، کہیں سوا لکھی ختم ہے، کہیں عرس ہے، کہیں شبینے ہیں، کہیں چالیسویں ہیں، کہیں فرقہ پرستی ہے اور کہیں تجویز اور میلاد، کہیں محافلِ مسالمے جمائی جا رہی ہیں اور کہیں تبلیغی نصاب کی بھرمار۔ غرض کیا کیا کچھ ہو رہا ہے کہ اوپر سے اس کمی کو الیکٹرانک نے پورا کر دیا اور انیس کا ہندسہ کرامات سے بھر دیا۔

آخر میں اتنا عرض کروں گا۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔

اسے ذرا وضاحت سے لکھتے ہیں۔

و م ا   ع ل ی ن ا ال ل ال ب ل ا غ   ا ل م ب ی ن
۱ ۲ ۳   ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷   ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳

و م ا کے لئے ۳۲۱ کا عدد آیا ہے جبکہ المبین کے نیچے لکھے ہوئے اعداد کو آپس میں جمع کریں تو تعداد ۱۲۳ بنتی ہے۔ یعنی ۳۲۱ دائیں طرف سے بھی آتا ہے اور پھر اس تبلیغ کو ایسا گھیر اگیا ہے کہ بائیں طرف سے بھی ۱۲۳ آتا ہے جو عام طور پر ہر تقریر اور تحریر کے آخر میں کہا اور لکھا جاتا ہے۔ یہ ہے عدد اعجاز ـــــ اور ہوئی نا بات ـــــ قرآن ان گورکھ دھندوں کا محتاج نہیں۔ قرآن قرآن ہے اور یہی کافی ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور بس۔

پلاٹ برائے فروخت

ایک کنال پلاٹ نمبر 36 - A واقع احباب کو اپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (G.II بلاک جوہر ٹاؤن اور نہر کے درمیان) لاہور کو موجودہ حالت میں ممبران سوسائٹی یا ممبران بزمِ طلوعِ اسلام یا فکرِ طلوعِ اسلام سے وابستہ اصحاب میں سے کسی ایک کو بیچنا مقصود ہے۔ خواہشمند حضرات مندرجہ ذیل پتہ یا فون پر رابطہ کریں۔

چوہدری غلام سرور

معرفت

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی - گلبرگ ۲ - لاہور - فون: ۶۳۶۷۰۴۸ - ۳۳۴۳۳۸

علی محمد چدھڑ

دعوے کی صداقت

ایک کسان جب اپنی فصل کاشت کرتا ہے تو اس کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایسے تمام طریقے بروئے کار لائے جو زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ فصل کی کاشت سے تو کچھ بھی حاصل نہ ہو اور کسان بلا سوچے سمجھے ہر بار اسی گھسے پٹے عمل کو دہراتا چلا جائے۔ اسی طرح کسی طبیب کا کوئی نسخہ اگر مریض پر کارگر نہ ہو تو وہ اپنی بے نتیجہ حکمت پر اصرار کی بجائے مرض کی تشخیص سمیت اپنے طریقۂ علاج پر دوبارہ غور کر کے یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ آیا نسخہ غلط ہے یا طریقۂ استعمال میں کوئی سقم رہ گیا ہے۔ لیکن ایک ہم ہیں جو حصولِ مقصد سے بے نیاز، نتائج سے بے پرواہ ہزار سال سے ایسے اسلام پر عمل پیرا ہیں جہاں غور و فکر کا احساس تو درکنار اس سلسلہ میں سوچنا بھی معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ یعنی بقول شاعر۔

ہر اک قدم پہ ٹھوکریں کھانے کے باوجود
کھائے فریبِ وعدۂ باطل جگہ جگہ

ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ ہمارا ہر عمل کیوں تخریبی نتائج کا حامل ہے۔ نیز ہم اس سربلندی سے کیوں محروم ہیں جس کا وعدہ خود خدا نے کر رکھا ہے۔ مثلاً فرمانِ خداوندی ہے کہ:۔

(۱) اے نبیؐ خدا تیرے لئے بھی کافی ہے اور مومنین کے لئے بھی جو تیرا اتباع کرتے ہیں (۸/۶۴)۔

(۲) ہم پر واجب ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدد کریں جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں (۳۰/۴۷)۔

(۳) اور نہ سست بنو اور نہ غم کرو، اگر تم مومن ہو تو تم ہی سربلند رہو گے (۳/۱۳۹)۔

(۴) اللہ نے اپنے رسولؐ کو یہ ضابطہ حیات یعنی حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ یہ دنیا کے تمام خود ساختہ نظام ہائے زندگی پر غالب آکر رہے اور خدا اس بات کی نگرانی کے لئے کافی ہے کہ ایسا ہو کر رہے۔ (۴۸/۲۸)۔

(۵) اگر یہ مخالفین تم سے جنگ کرتے تو شکست کھا کر بھاگ جاتے۔ پھر ان کا نہ کوئی حمایتی ہوتا نہ سرپرست (۴۸/۲۲)

(۶) تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عملِ صالحہ کرتے رہے۔ ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو روئے زمین میں حکومت عطا کرے گا (۲۴/۵۵)۔

ان آیاتِ مقدسہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جن مراعات و اعزازات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے ہم محروم ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے جبکہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا (۳۰/۶) تو اس کا صرف ایک اور حتمی جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم بزعمِ خویش جس اسلام پر عمل پیرا ہیں وہ خدا کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ ممکن ہے ہمارے بعض خوش فہم حضرات اس میں مبالغہ یا مغالطہ کا پہلو تلاش کریں لیکن حقائق کو تسلیم کئے بغیر کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی۔ ایک طرف اگر مروجہ مذہب کے عقیدت مندوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جائے تو بڑی بھیانک تصویر اُبھرتی ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے آشیاں و قفس کا فرق مٹا دیا ہے۔ مغربی اقوام کی حاشیہ برداری سے ملت کا تصور دھندلا چکا ہے۔ دوسری طرف دینِ خداوندی کی تائید میں استخلاف فی الارض اور انتم الاعلون کے لاتعداد قرآنی دعاوی ہیں جو آج بھی ہمیں صدرِ اوّل کی یاد دلا رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان ہر دو صورتوں میں اتنے بڑے تضاد کے اسباب کیا ہیں۔ دینِ اسلام کی تھیوری اور پریکٹیکل میں زمین و آسمان کا فاصلہ کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ یہاں محض عقائد کی بات نہیں۔ اگر قرآنی دعاوی کے ساتھ ساتھ تاریخی شواہد بھی پیش کر دیئے جائیں، تو مطلع صاف ہو جاتا ہے اور موجودہ دَور کے انسان کو بھی چونکا دینے والی حیرانی کے باوجود معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قدر کمزور بے سروسامان اور ناتواں لوگوں کی مٹھی بھر جماعت کے سامنے اس زمانے کے بڑے بڑے فرعون کس طرح پا بہ زنجیر کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے۔

میرے محترم قارئین! یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنی عظمت کے معجزاتی نقوش دنیا جہان کے علوم کو عاجز کر دیتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ سنہری PERIOD نہایت مختصر تھا۔ لیکن تمام بنی نوع انسان نے استخلاف فی الارض اور جنتِ ارضی کا عملی نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ قرآن کے تمام دعاوی ایک ایک کر کے پورے ہوئے اور جب حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بلند ہوا تو قیصر و کسریٰ کے جھنڈے سرنگوں ہو گئے۔ ہمارے اپنے مانیں یا نہ مانیں۔ لیکن اُس وقت کی زخم خوردہ سُپر طاقتوں نے بھانپ لیا کہ اسلام کے اس عظیم انقلاب اور صحرا نشینوں کی طاقت کا راز قرآن کی بے مثل اور بیّن آیات میں ہی پوشیدہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک بین الاقوامی سازش کے تحت جسے علامہ اقبالؒ نے عجمی سازش کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کتاب اللہ کو مہجور کر کے اس کی جگہ مثلہٗ معہٗ کی خوشنما جلدیں ہمارے دین کی اساس بنا دیں جس کا نتیجہ اسلام دشمن عزائم کے توعین مطابق ہے اور ہماری بربادیوں کے قصّے آج تک ہر گھر کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔

انگریزی میں ایک محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ کام اچھا ہے جس کا انجام اچھا ہے۔ قرآن اسے یوں بیان کرتا ہے کہ صحیح نتائج ہی کسی کام کی صداقت کی علامت ہیں۔ اسی اصول کی بنیاد اور اعتماد پر پیغمبرِ اسلام کفار کو چیلنج کر رہے ہیں کہ "تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ تمہارے پروگرام کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ میں اس سے بری الذمہ ہوں گا۔ میرے پروگرام کا نتیجہ میرے سامنے آجائے گا۔ اس کی کچھ ذمہ داری تمہارے سر نہ ہوگی، بات صاف ہو جائے گی" (۱۰/۴۱)۔ سورہ طٰہٰ کی آخری آیت میں فرمایا کہ (اے رسول منکرینِ حق سے کہہ دو) میں اپنے پروگرام کے نتائج کا انتظار کرتا ہوں، تم بھی انتظار کرو۔ عنقریب تم جان لوگے کہ ہم میں سے کون ہے جو ہموار اور سیدھی راہ پر چل رہا ہے اور وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا (۶/۱۳۶ ؛ ۲۰/۱۳۵)۔ قرآن کہتا ہے کہ سیدھی راہ کی علامت یہ ہے کہ اس پر چل کر انسان منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو کتاب اللہ نے ۱۰/۲۰ اور ۳۲/۳۰ میں بھی بیان کر دیا ہے۔

قرآن کے اس معیار پر پورا اُترنا تو دُور کی بات ہے۔ ہمارا مروجہ مذہب اس کے بالکل برعکس نتائج کا حامل ہے۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی پچاس سے زائد ایسی (آزاد) ریاستیں ہیں جہاں اسلام کے نفاذ کے لئے بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں۔ پھر بھی دنیا کے کسی خطہ میں خدا کے قانون (قرآن) کے نفاذ کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر اقوامِ متحدہ کے مسلم اور غیر مسلم کل ۱۸۴ ممبر ممالک کا شمار کر لیا جائے تو مسلمانوں کی کل آبادی ڈیڑھ ارب تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ان کی سیاسی، اقتصادی اور فوجی حیثیت کسی گنتی میں شمار نہیں ہوتی اور بزمِ جہاں میں

نظر اٹھا کے کوئی ہم کو دیکھتا بھی نہیں
اگرچہ بزم میں سب روشناس بیٹھے ہیں

جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل میں غلبہ اور قبضہ غیر مسلموں کا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ہم پسماندہ اقوام میں شامل ہیں۔ صحت اور خوراک کو ملحوظ رکھیں تو اور بھی افسوسناک نقشہ سامنے آتا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ کیا ہماری موجودہ زبوں حالی موجودہ خود ساختہ اور غلط مذہب کا نتیجہ تو نہیں اور اگر مروجہ مذہب عین اسلام ہے تو پھر بقول قرآن دینِ خداوندی کی برکات اور سرفرازیاں کہاں ہیں۔ چلو کچھ دیر کے لئے موجودہ اسلام کو ہی ہم حضورؐ کے پروگرام کا حصہ فرض کر لیتے ہیں تو پھر اس سیدھی راہ کے خوشگوار نتائج کدھر گئے جس کے لئے آپ نے کفار کو انتظار کرنے کا چیلنج کیا تھا اور جو اپنے وقت پر برآمد ہو کر رہے۔ چونکہ نتائج متضاد ہیں۔ لہٰذا مروجہ اسلام دینِ خداوندی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اور جس طرح کتاب اللہ کے فرمان کے مطابق تاریکی اور روشنی، دھوپ اور سایہ، مردہ اور زندہ برابر نہیں ہو سکتے، اسی طرح مآل اور نتائج کے اعتبار سے دینِ خداوندی اور مروجہ مذہب برابر نہیں ہو سکتے۔ یہاں

ایک اور نکتہ بھی سامنے آتا ہے۔ اسلام میں نہ کسی اندھی تقلید کی گنجائش ہے نہ وہ چھومنتر کا مذہب ہے بلکہ ایسا دین ہے جو ہمیشہ دلائل و نتائج کی بات کرتا ہے۔ یہاں تک کہ نظامِ خداوندی کا سارا سلسلہ نتائج کے محور کے گرد ہی گردش کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو بالحق پیدا کیا تاکہ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ برآمد ہو جائے اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہ ہو (۴۲/۲۲)۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ یہ تمام کارگہ کائنات اس لئے سرگرم عمل ہے کہ انسان کا ہر عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ پیدا کرے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں ہمارے مذہبی اکابرین سر جوڑ کر بیٹھتے اور اسلام کو اصل کسوٹی (قرآن) پر پرکھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن بُرا ہو ہماری اندھی عقیدت اور باطل تصورات کا جس نے تمام اعمال کے نتائج کو روزِ آخرت پر اُٹھا رکھا ہے۔ گویا انسانی اعمال کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک مقولہ ہے کہ درخت ہمیشہ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ کسی نظام کی پرکھ یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے کس حد تک نفع بخش ہے۔ اسی سے ملتا جلتا قرآنی کلیہ یہ ہے کہ (کسی کام یا نظام کے) نتائج ہی صداقت کی علامت ہیں (۲۰/۱۳۵)۔ مروجہ مذہب یا ہمارا موجودہ اسلام ان میں سے کسی ایک معیار پر بھی پورا نہیں اترتا۔ اگر کوئی اعتراض کرے کہ موجودہ اسلام ہی دینِ خداوندی ہے اور مسلمانوں کی موجودہ حالت کا سبب ان کی کوتاہیاں اور بداعمالیاں ہیں تو قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صراطِ مستقیم ایک، ٹیڑھے راستے بے شمار۔ ٹھیک نشانے کا مقام ایک، غلط نشانے کے مقامات لاتعداد، ٹھیک جواب ایک، غلط جوابات ان گنت، خدا کا دین ایک، انسانوں کے خود ساختہ مذاہب بے شمار (۱۵/۴۴)۔ باقی رہا بداعمالیوں کا سوال، تو اگر کسی ادارے کا سلیبس ہی ناقص اور غیر معیاری ہوگا تو ڈاکٹر اور انجنیئر بھی ویسے ہی پیدا ہوں گے۔

اب جبکہ حقیقتِ حال پوری طرح عیاں ہو چکی ہے تو مسلمان ہونے یا کہلانے کی حیثیت سے اگر ہم اپنی جھوٹی انا اور تعصب کو خیرباد کہہ کر دینِ خداوندی کی طرف لوٹ آئیں تو انشاء اللہ عزت، سربلندی، غلبہ، نصرت اور استخلاف فی الارض جیسی تمام عنایاتِ خداوندی کے ہم ایک بار پھر مستحق ہو جائیں گے اور یہ سب کچھ قانونِ خداوندی پر عمل درآمد کے ثمر کے طور پر ملے گا۔ جہاں تک مروجہ مذہب یا موجودہ اسلام کا تعلق ہے تو اس کی حالت ایسے ڈاکٹر کی ہے جو خود تو بیمار ہے۔ لیکن دوسرے مریضوں کے حتمی علاج اور شفا کا دعوے دار بنا بیٹھا ہے۔ گداگری کا کشکول ہاتھ میں لے کر لوگوں سے کہنا کہ ہمارے پاس ایسا نسخہ کیمیا ہے جو پتھر کو سونا بنا دیتا ہے، جگ ہنسائی نہیں تو اور کیا ہے۔

ہمارے اکثر بلکہ تمام مذہب گزیدہ حضرات ایسے ہی بے سروپا دعووں اور اندھی تقلید کی روش اختیار

کیے ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ "ایسے لوگ نہ دلیل و برہان سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی تاریخی شواہد کا مطالعہ کرتے ہیں کہ گذرے ہوئے واقعات سے کچھ نتائج اخذ کرلیں۔ ان کے آگے بھی جہالت کی دیوار کھنچ جاتی ہے اور پیچھے بھی۔ اس طرح ان کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ عقل و بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں (۹/۳۶)۔

O

رحمت اللہ طارق

عورت کی نصف گواہی کیوں اور کیسے؟

محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب ناآشنا ان چہروں میں سے ہیں جن سے میرے دلی احترام کا رابطہ دو زاویوں سے استوار ہے۔ قرآن کے زاویہ سے کہ ہم دونوں ہم سفر اور طالبِ قرآن ہیں اور بیلچہ کے زاویہ سے کہ ماضی میں ہماری منزل ایک ہی رہی ہے کہ ہم دونوں نے ہر گونہ سامراج سے بغاوت کی ہے کہ ہمارے نزدیک سامراج مغربی ہو خواہ اسلامی، دونوں ہی علو اور استکبار کے نمائندے اور کمزور انسانوں کو مزید قعرِ مذلت میں دھکیلنے والے ہیں۔ تاہم مغربی سامراج نے علم و سائنس کے زور پر پاپائیت کے جنازے کو نہلا دھلا کر دفنا دیا ہے اور ہم شیخیت اور ملائیت کو درگور کرنے میں ہنوز ناکام ہیں اور نہ معلوم کب تک خائب و خاسر رہیں گے۔ بہرحال ہم دونوں طالبِ قرآن ہیں اور ہماری جدوجہد کا ماحصل انسانیت کے دلوں میں "رجعت الی القرآن" کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

دسمبر ۹۳ء کا طلوعِ اسلام میرے سامنے ہے۔ اس میں ڈاکٹر موصوف کا ایک پُرمغز مقالہ 'عورت کی حکمرانی' باصرہ نواز ہوا اور دل نے چاہا کہ عورت کی نصف گواہی کی بابت ان کی توجیہہ کو اگر مزید اجاگر کیا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا۔ ویسے تو عورت کی گواہی کے بارے میں، میں بھی وہی بات کہوں گا جو ڈاکٹر موصوف فرما چکے ہیں بس فرق اتنا ہوگا۔ میں سرسید، چراغ علی اور محسن الملک کی روش کے مطابق اپنے اعتماد پر کچھ کہنے کی بجائے قدیم کے کسی حوالہ سے بات چلاؤں گا کہ ہر انسان فطرتاً ہر بات کے حوالے اور ہر استدلال کی سند کا خواہاں بھی ہے اور بنیاد پرستی کی افتاد کے مطابق اس کی تشنگی قدامت کے پانی ہی سے بجھ سکتی ہے۔ وہ تنہا قرآن کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہوگا کہ ملاں اور ملوک نے اسے روک رکھا ہے ان کا نمائندہ ہر اس موڑ پر کھڑا ہے جہاں سے کوئی راستہ، کوئی سی پگڈنڈی اور کوئی سا کوچہ سوئے قرآن جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے دشمنِ جاں سے چومکھی لڑنے کے لئے ان ہی داؤ پیچ سے کام لینا ہوگا جو وہ خود اختیار کر لیتا ہو۔ امید ہے کہ میرا مفہوم واضح ہو چکا ہوگا۔

عورت کی نصف گواہی

جو لوگ قرآن کے حوالہ سے عورت کی نصف گواہی پر زور دیتے ہیں ان پر واضح ہو کہ قرآنِ محکم میں نصف کی سرے سے بات ہی نہیں ہوئی۔ ایک ان پڑھ معاشرے اور کم تعلیم سوسائٹی میں لین دین کا مدار تحریر پر نہیں ہوتا، زبانی کلامی گواہی پر ہوتا ہے۔ ایسے ہی معاملات میں اس وقت کی عورت کی طبعی یکسوئی کو دیکھتے ہوئے کہا گیا ـــــ دو گواہ بناؤ۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد، دو عورتیں ہوں۔ اور پھر ساتھ ہی عورتوں کے دو ہونے کی وجہ بھی بتلا دی کہ ـــــ ایک عورت اگر کسی نفسیاتی خوف یا عدالت کے سامنے کچھ بولنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے اور گواہی کے الفاظ ٹھیک طور پر ادا نہ کر سکے یا گواہی کے بعض اجزا بھول بیٹھے، تو اس کی تلافی کے لئے دوسری عورت لقمہ دیکر اس کی گواہی کو صحیح جہت دے دے۔ یہ نہیں کہ دو عورتوں کی گواہی مل کر ایک مکمل گواہی کا بدل ہوگی۔ بات کیا ہوئی کہ یہاں فیصلہ مشروط ہے اور اصولِ انصاف کی رُو سے مشروط فیصلے اپنی شرط کے محور پر گھومیں گے اور جہاں شرط یا "علت" زائل ہوگی فیصلے اپنی روٹین کے مطابق غیر مشروط ہی ہوں گے۔ یعنی کوئی عورت اگر ہر مرحلے میں پوری وضاحت سے بیان دے ڈالتی ہے تو اس کی گواہی بغیر کسی لقمہ دہی کے کارگر ہوگی۔ امام بیضاوی معتزلی (۱۲۸۰ م)

والعلۃ فی الحقیقۃ التذکیر۔

"یہاں مطلوبہ گواہی یاددہانی کی "علت" سے مربوط ہے۔ حافظہ ٹھیک ہے تو یاددہانی کی حاجت نہیں ہے۔" (تفسیر بیضاوی طبع قسطنطنیہ ۱۳۲۹ھ صفحہ ۶۴ سطر ۲۸)

اسی طرح شہاب الدین حنفی آلوسی (۱۸۵۴ء) جو حنفیوں میں کسی حد تک روشن خیال دانشور گزرے ہیں اعتراف کرتے ہیں کہ یہاں ایک عورت دوسری عورت کی صرف یاددہانی کرائے گی۔

(روح المعانی طبع منیریہ مصر جلد ۳/۵۸)

ان دو تفسیری دانشوروں کی وضاحت کے باوصف جو لوگ دوسری عورت کی یاددہانی کو پہلی عورت کی گواہی کا تتمہ کہہ کر پھر دونوں کی گواہی کو مکمل گواہی کا متبادل کہتے ہیں وہ نہ تو "الفاظ قرآن" کے اداشناس ہیں اور نہ ہی فہم قرآن کا اجلا مذاق رکھنے والے ـــــ ان کے جواب میں سلفی مفسر عماد الدین ۔ ابن کثیر (۱۳۷۲ء) جن کی تفسیر کو اصلِ قرآن پر ترجیح دی جاتی ہے، فرماتے ہیں ـــــ ومن قال شہادتہا معہا تجعلہا کشہادۃ ذکر فقد ابعد والصحیح ہو الاول۔

جو حضرات کہتے ہیں کہ دونوں عورتوں کی گواہی دراصل مرد کی مکمل گواہی کا بدل پیش کرنے کے لئے ہے، تو ان کی بات دور از کار ہے اور حقیقت وہی ہے جو قرآن پاک نے خود ہی

واضح کی ہے کہ دوسری خاتون گواہ شمار نہ ہو گی۔ اس کا رول یاددہانی تک محدود ہو گا۔

(تفسیر ابن کثیر طبع مصر جلد ۱/۳۳۵/۳۰ تا ۳۱)

اس طرح آیہ زیرِ بحث اور ابنِ کثیر کی توجیہ سے بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ گواہی کے معاملہ میں مرد بھی اگر خامکار ہے۔ گواہی کے الفاظ گواہی کے اصولوں کے مطابق ادا کرنے سے قاصر ہے تو اس کی گواہی بھی کسی کام کی نہ ہو گی۔ اس کے لئے نہ لقمہ دہی کی گنجائش ہے اور نہ ہی اجازت — جس سے اس کی گواہی خودکار حیثیت سے مسترد ہو جاتی ہے۔ اسے تمام فقہی حیلہ گریوں سے قابلِ قبول نہیں بنایا جا سکتا۔ اس طرح گویا قرآن پاک نے عورت کی تنہا گواہی کو مرد کی گواہی پر نہ صرف فضیلت دی ہے یہ بھی واضح فرمادیا ہے کہ عورت کی گواہی کی اتنی قوت مسلّم ہے کہ مسترد نہیں ہو پاتی۔

عورت اس وقت تین بڑے اسلامی ملکوں میں سربراہی کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ نہ بنگلہ دیش میں اس کی قیادت کو زیرِ بحث لایا گیا ہے نہ ترکی میں۔ صرف پاکستان ہی میں ایوانِ مذہب میں بھونچال آگیا اور انہوں نے جنگِ جمل میں سیدنا علیؓ کی حمایت میں بنائی جانے والی 'ایک روایت' کی اساس پر ہی دخترِ صدیقؓ کو بنت کسرے سے اور صحابہ رسولؐ کو ملّتِ کسرے سے تشبیہہ دے کر جہنمیوں کا ٹولہ بنا ڈالا۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ یخرج قوم ھلکیٰ لا یفلحون قائدھم امرأۃ فی الجنۃ ٥

عوف البوجمیلہ (۱۵۲ھ) رافضی نے (علی کی حمایت میں) جو روایت پیش کی تھی وہ بخاری میں ہونے کے باوصف زیادہ وزنی نہیں تھی۔ چنانچہ جن لوگوں نے عائشہؓ کی مخالفت اور علیؓ کی حمایت کی ان کے سامنے یہ روایت تھی کہ اس کے الفاظ واضح اور مفہوم غیر مبہم تھا یعنی کہ 'عنقریب (صحابہ کی) ایسی قوم سامنے آئے گی جن کی قیادت (عائشہ جیسی) عورت کے ہاتھ میں ہو گی جو اہلِ جہنم ہوں گے۔ (یہاں 'اہلِ جہنم ہوں گے' واضح فقرہ ہے)۔

(فتح الباری طبع سلفیہ مصر جلد ۱۳/۴۷)

حافظ ابن حجر (۱۴۴۹ء) ہمہ تاویل گری کے باوصف بخاری کی روایت کو اہمیت نہیں دیتے جبکہ پاکستان کے بنیاد پرستوں اہلِ حدیث اور سپاہ صحابہ کے مناظرہ باز ملّاؤں کا سارا زور بخاری کی روایت پر ہے۔ ادھر تاریخ گواہ ہے کہ قاتلین عثمانؓ کو دیکھنے والا کوئی مرد عینی گواہ نہیں تھا۔ حضرت عثمان کی رفیقہ محترمہ حضرت نائلہ تھیں۔ جن کی گواہی پر قاتلینِ عثمان کی شناخت ہوئی اور پوری امت نے عورت کی تنہا گواہی پر اعتماد کر کے قتل کا مطالبہ حضرت علیؓ سے کر ڈالا۔

یہ یاد رہے کہ عوف بن ابی جمیلہ نے جنگ جمل کو جائز قرار دینے کے عرصہ بعد ایک روایت بنا ڈالی تو مبہم ہونے کے باوصف تابعیوں کے امام مہلب ازدی (۷۰۲ھ) اور بعد میں بخاری کے اوّلین شارح علی بن خلف (۴۴۹ھ) نے برملا اس روایت کو جھٹلایا اور کہا کہ

یہ تو صرف دخترِ صدیقؓ کے سیاسی موقف کو کمزور کرنے اور اس کی ذات کو ہدفِ ملامت بنانے کے لئے وضع کی گئی ہے۔ (فتح الباری طبع مصر جلد ۱۳/۴۷/۴ تا ۵)

ثریا عندلیب

تفکّر و تدبّر پرویز علیہ الرحمۃ

(بیادِ پرویز علیہ الرحمۃ)

مبدا فیض نے اپنی کرم گستری سے جو چیزیں نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کی ہیں، طاغوتی قوتیں ان پر بھی اپنا تسلط جما لیتی ہیں اور کمزوروں کا ان میں کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ مستبد قوتیں انہیں اپنی ملکیت سمجھتی ہیں اور باقی انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا کی یہ وسیع و عریض زمین، دریاؤں کے زرفشاں پانی، زمین کے خزائن و دفائن سب خدا کی عطا فرمودہ نعمتیں ہیں جو کسی انسان نے اپنے کسب و ہنر سے پیدا نہیں کیں۔ لہٰذا ان پر ذاتی قبضہ ظلمِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے ان کی تقسیم اس طرح نہیں ہونی چاہیئے کہ جو صاحبِ قوت و اقتدار ہو وہ سب کچھ سمیٹ کر اپنے قبضہ میں کر لے اور کمزور و ناتواں نانِ شبینہ تک کے بھی محتاج ہو جائیں۔ ان کی تقسیم انسانی ضروریات کے مطابق ہونی چاہیئے۔ جسے جس قدر ضرورت ہو اسے اسی قدر مل جائے۔ اس لئے رزق کے سرچشموں پر کسی کا انفرادی قبضہ اور ملکیت جائز نہیں۔

○

قرآنِ کریم پر غور کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ وہ سماعت و بصارت یعنی SENSE PERCEPTIONS کو علمِ انسانی کے حصول کے ذرائع قرار دیتا ہے اور تجربات و مشاہداتِ حسّی کے ذریعے تسخیرِ فطرت کی تلقین کرتا ہے اور بار بار کہتا ہے کہ اس کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ کس محکم نظام کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے اور اس سے کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں۔ وہ تخلیقِ ارض و سمٰوٰت، تکویرِ لیل و نہار، تنویرِ شمس و قمر، تقدیرِ شجر و حجر، غرضیکہ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرّہ خاک سے لے کر بڑے سے بڑے محیّر العقول نظامِ فلکی تک ہر شے میں غور و فکر پر علم الاشیاء کی محکم عمارت قائم کرتا ہے۔ مسلمان اسی انداز تحقیق و تفتیش کو لے کر اٹھے اور جس شاہراہِ زندگی پر جادہ پیما ہوئے، کائنات کی مستور قوتوں نے ان کے سامنے اپنے

فلسفہ فکری صلاحیتوں کو جلا دیتا ہے تاکہ ان سے عمل کی راہیں روشن ہو جائیں۔ لیکن اگر کوئی قوم محض فلسفی بن کر رہ جائے اور عمل کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے تو اس کی مثال اس کی راہ رَو کی سی ہوگی جو راستہ چلنے کے لئے شمع تو روشن کرے لیکن اس شمع کو لے کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسافر عمر بھر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ جو قومیں عمل سے بیگانہ ہو جائیں ان کے مفکر مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل کرنے میں دماغ سوزی کرتے رہتے ہیں اور ان کے لیڈر اسکیمیں بنانے میں مصروف اور بیانات دینے اور تقریریں کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ نہ ان مفکرین کی فکر اور نہ ان لیڈروں کے الفاظ قوم کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ جو قوم زندگی کے عملی مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کر کے نظری مباحث میں الجھ کر رہ جاتی ہے اس کی موت یقینی ہے۔

○

اسلام میں نظامِ زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے جو ایک عبد مسلم کے فکر و نظر اور اعمال و احوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یعنی انسان کو (خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ) دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ نسل یا ملک کی تقسیم سے انسانیت کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مارِ پیچاں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں اور اس کی زندگی جہنم بنا رہے ہیں۔ آج ایک نسل دوسری نسل سے برسرِ پیکار ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کے ساتھ فوج کشی کر رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ یہ سب اس لئے کہ وحدتِ خلق کے بجائے نوعِ انسان کو غیر فطری امتیازات سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو کاٹ رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ اپنا ہی دست و بازو ہے کسی غیر کا نہیں۔ معدہ اس فکر میں ہے کہ جو خوراک اس میں جا پہنچی ہے اسے اپنی ہی چار دیواری میں محبوس کر لے۔ اسی دل و جگر کی یہ کوشش ہے کہ خوراک کو معدہ تک پہنچنے ہی نہ جائے بلکہ حلق سے نیچے اترتے ہی جھپٹ لی جائے۔ جس قسم کے نظام میں اس قسم کی نفسانفسی پیدا ہو جائے اس کا انجام معلوم!

○

قرآنِ کریم کی رُو سے اجزائے ایمانیہ پانچ ہیں۔ قرآن میں کسی جگہ خواہ ان میں سے ایک کا ذکر ہو یا ایک سے زیادہ کا، مقصود اس سے پانچوں اجزا ہیں۔ ان میں سے ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ ان پانچ اجزائے ایمانیہ میں نبی اکرمؐ کی رسالت اور قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان بھی لازم و لاینفک ہے۔ ایمان سے مفہوم صرف اقرار

کر لینا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اطاعت بھی ہے۔ ہر رسول اور ہر کتاب خداوندی کی اطاعت اپنے اپنے وقت میں تھی اور نبی اکرمؐ کے بعد اطاعتِ خدا کی آخری کتاب قرآنِ کریم کی ہوگی نہ کہ پہلی کتابوں کی۔ قرآن کے تشریعی احکام نظامِ اسلامی کا ضروری جزو ہیں اور ان کی اطاعت لازمی ہے۔

○

قرآنِ کریم کی جامع اصطلاح صراطِ مستقیم بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ قرآن سے پہلے ذہنِ انسانی زندگی کی دَوری حرکت کا قائل تھا جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکیاتی DYNAMIC تصور پیش کر کے یہ بتایا کہ حیات کسی چکر (۳۶/۴۰) میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے کی ہے۔ صراطِ مستقیم سے اس غلط فلسفۂ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال اور اس صحیح مقصودِ حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا۔ پھر چونکہ لفظ مستقیم میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے۔ اس لئے اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ زندگی مختلف قوتوں میں توازن رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ "صراطِ مستقیم" پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی۔ یعنی ایسا خط جو کسی نچلے نقطہ سے اوپر کے نقطہ کی طرف جائے۔ لترکبن طبقا عن طبقٍ (۸۴/۱۹) تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے جاؤ۔ اس نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ "صراطِ مستقیم" تمہارے اس نشوونما دینے والے (رب) کی راہ (قانون) ہے جو "ذی معارج" (۷۰/۳) ہے۔ یعنی "سیڑھیوں والا خدا"۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اوپر لے جانے کا ذریعہ بھی۔ گھسٹنے اور ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے جمپ کرتے ہوئے اوپر چڑھنے کا ذریعہ۔ یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اقطار السمٰوٰت والارض (۵۵/۳۳)۔ یعنی موجودہ زمان و مکان کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے مگر یہ ارتقاء اس نظامِ ربوبیت کے بغیر ناممکن ہے جو قرآن کی رو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نظام میں انسانی معاشرہ انہی خطوط پر متشکل ہو جاتا ہے جن خطوط پر خارجی کائنات خدائی قوانین کے سامنے طوعاً و کرہاً سجدہ ریز اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلی جا رہی ہے۔ یعنی خارجی کائنات طوعاً و کرہاً مشیت کے پروگرام کو پورا کر رہی ہے۔ لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے اختیار و ارادہ سے اس پروگرام کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک عظیم القدر پروگرام کی تکمیل میں ایک دوسرے کے رفیق۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

"اس ارتقائی تبدیلی کے طرف و نہج میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس باب میں پہل کرے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ اگر وہ اس باب میں پہل نہیں کرتا۔

اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔ اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی قساوت اختیار کر لیتی ہے اور وہ (انسان نہیں رہتا بلکہ) جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (خطباتِ تشکیلِ جدید)

○

جس معاشرے میں انسانی جسم کے تقاضے بطریقِ احسن پورے ہوتے ہیں، جہاں انسانی اختیارات کے حدود وسیع سے وسیع تر ہوتے رہیں اور جہاں انسانی اختیارات کا استعمال وحیٔ خداوندی (قرآن) کی روشنی میں ہو۔ وہ قرآنی معاشرہ یا مسلمان کی زندگی ہے۔ اس معاشرہ میں انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھے گی۔ اس میں تمام خارجی دنیا کی تسخیر ہوگی (و سخر لکم ما فی السمٰوٰت و الارض جمیعاً) اور چونکہ انسانی جسم بھی خارجی (طبعی) دنیا سے متعلق ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی تسخیر ہوگی یعنی جسم کا کام انسانی قوتِ فیصلہ (نفس) کے لئے معلومات فراہم کرنا اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا۔ اس قوت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائے گی اسی قدر انسانی زندگی ابدیت (IMMORTALITY) سے ہمکنار ہوتی جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبعی قانون کے ماتحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ ذات (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔ اس قوت کی پختگی اور وسعت صرف اسی نظام میں ہو سکتی ہے جسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے اختیار و ارادہ سے دوسروں کی پرورش و تربیت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس سے اس کے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی جسم کے تقاضوں کے پورا کرنے کا انتظام از خود موجود ہو۔ اس نظام میں یہی ہوتا ہے ہر فرد کی تمام بنیادی ضروریات (جسم کے تقاضوں) کے پورا کرنے کا ذمہ نظام اپنے سر لے لیتا ہے اور افراد اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی محنتوں کے ماحصل کو پورے کے پورے معاشرے کی تعمیر و تربیت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ معاشرہ (حزب اللہ) جس کی کھیتی پکتی ہے (ھم المفلحون) جس کے درخت برگ و بار لاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ جو سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزلوں میں پہنچنے کے اہل ہوتے ہیں۔

○

اسلام میں خدا پوجا پاٹ کی شے (OBJECT OF WORSHIP) نہیں بلکہ حاکمِ اعلیٰ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان پرستار اور پرستیدہ کا تعلق نہیں بلکہ حاکم اور محکوم کا تعلق ہے (حاکم اور محکوم اس معنی میں نہیں جس معنی میں عام دنیاوی حکومتوں میں سمجھا جاتا ہے)۔ دین سے مفہوم خدا کی پرستش نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت کا عملی اقرار

ہے۔ یہاں نیک عملی سے مقصود ایک ضابطۂ اخلاق کی پیروی نہیں جو ہر جگہ یکساں ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کی ہستی کے منکر ہیں ان کے ہاں بھی وہی ضابطۂ اخلاق ہے۔ اسلام میں نیک عملی سے مراد اس ضابطۂ قانون کی اطاعت ہے جو خدا کی حکومت کا دستور اساسی ہے۔ اسلام کا تقابل ضوابطِ اخلاق سے نہیں بلکہ دنیا کے ضوابط قانون و دساتیر سے ہوگا۔ نظامِ حکومت اور آئینِ سلطنت سے ہوگا۔ اخلاقی ضابطہ تو اس ہمہ گیر ضابطۂ قانون کا ایک گوشہ ہے۔ اس نظامِ حکومت (دین) اور دنیا کے دیگر نظامہائے حکومت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یہاں اصولاً قانون سازی کا اختیار کسی کو نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے ہیں۔ یہ ہے وہ امتیازی خصوصیت جو کسی اور نظامِ حکومت کو حاصل نہیں۔

گوہرہائے تابدار

- تمہاری ذات کو اس قدر محکم ہونا چاہیئے کہ موت کا دھچکہ بھی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔
- خدا کی صفتِ ربوبیت کی کبریائی عالمِ انسانیت میں ہونی چاہیئے۔
- ہمارے ہاں جو چیز پرانی ہو جائے وہ مذہبی بھی ہو جاتی ہے مقدس بھی۔
- وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے جو ہر نفس سے عمرِ جاوداں پیدا کر (اقبالؒ)

(مرتبہ: ثریا عندلیب)

خان افضل آفریدی

دینِ واحد سے مختلف مذاہب تک

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ (۴۲/۱۳)

"اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اُس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔"

قرآنِ حکیم ایک مکمل سائنٹیفک کتاب ہے۔ سائنٹیفک اس لئے کہ اس کی ہر آیت و حدیث (بات) دو اور دو چار کی طرح درست ثابت ہوتی ہے۔ اس کا ہر لفظ حکمت سے پُر اور ٹھوس حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کو ٹھکرانا انسانی علم و حکمت اور فلسفہ و منطق سے بعید بلکہ ناممکن ہے۔ قرآن سابقہ تمام کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ پچھلی قومیں اپنی اپنی کتابوں میں تحریف کی مرتکب ہو چکی ہیں۔ چنانچہ اس آخری اور مکمل ضابطۂ حیات کو زمانے کی دستبرد سے مامون رکھنے کے لئے خداوند کریم نے اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ایک تھا۔ تمام پیغمبرؑ اسی ایک پیغام کو اپنے اپنے وقتوں میں اپنے اپنے علاقوں میں اپنی اپنی قوموں کو پہنچاتے رہے۔ وہ سب کے سب مسلمان تھے۔ ان کا دین اسلام تھا۔ ہر پیغمبرؑ اپنے اپنے دور میں مومنین کی ایک ایک جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوتے رہے۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر غریب اور محنت کش طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ زردار اور زر پرست طبقہ خدا کے ان نیک بندوں کی ہمیشہ مخالفت کرتا۔ خدا کے پیغام کو دل کے کانوں سے ہرگز نہ سنتا بلکہ اُلٹا ہنستا اور تمسخر اڑاتا۔ مومنین پر طرح طرح سے ظلم ڈھاتا۔ یہاں تک کہ ان پر زندگی دوبھر ہو جاتی۔ آخر کار پیغمبرؑ وقت اپنے آقائے کل کی مرضی کے مطابق اپنے پیروکاروں کو اپنے

ساتھ لیتے ہوئے اپنے مادرِ وطن سے ہجرت کر جاتے اور ایک نئے وطن اور اجنبی لوگوں میں خدا کا دین (ضابطۂ حیات) قائم کرنے میں مگن ہو جاتے۔

ہر پیغمبر کے اس جہانِ فانی سے مراجعت کے بعد خدا کے قائم شدہ دین یعنی ضابطۂ حیات کو کچھ عرصہ کے لئے ہر پیغمبر کے پہلے چند جانشین (خلفاء) من وعن قائم و دائم رکھنے کی سرتوڑ کوششوں میں لگے رہتے۔ احکاماتِ الٰہی پر بے لاگ و لپٹ سختی سے قائم رہتے بلکہ دوسروں کو بھی اتباع پر مجبور کرتے رہتے۔ مگر ان مردانِ باکمال کے اُٹھ جانے کے فوراً بعد دینی معاملات عام علماء کے قبضۂ قدرت میں چلے جاتے جو اپنی نفسیات، ضد اور انا کی بنا پر اختلافات میں پڑ جاتے۔ اس موقع پر امراء اور صاحبِ اختیار طبقہ اپنے گل کھلانے کے لئے میدانِ سیاست میں کود پڑتے۔ مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعہ چوٹی کے چند علماء کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اپنے اقتدار اور دولت و ثروت کو دوام دینے کے لئے دین میں اپنے لئے نرم گوشے تلاش کروا لیتے۔ یہ عمل آہستہ آہستہ جاری رہتا حتیٰ کہ دین کو سیاست سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ اسی افسوسناک موڑ کے لئے تو اقبالؒ کو یہ کہنا پڑا کہ ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تو دین جب سیاست سے جدا ہو جاتا تو اس کی مثال ایک ٹوٹی ہوئی تلوار کی مانند ہو جاتی۔ دین کو جب اس طرح بے اثر کر دیا جاتا اور ملکی معاملات سے اس کا کوئی ناطہ نہ رہ جاتا، تو عام لوگ خدا کی کتاب کو جو درحقیقت ایک قانون کی کتاب ہے اور تھی، کو بغیر سمجھے بوجھے بطور ثواب پڑھنا شروع کر دیتے اور چند ظواہر و رسوم کو مکمل دین سمجھ کر اپنے اپنے پیر و مرشد کے مسلک پر چل پڑتے۔ حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ دین تو ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ کسی صورت بھی ملکی سیاست سے جدا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس سے مراد چند ظواہر و رسومات ہیں۔ اس تمام تر خرابی میں مندرجہ ذیل عوامل ہمیشہ پیش پیش رہے:۔

۱۔ امراء اور صاحبِ اختیار طبقہ کے ہتھکنڈے۔

۲۔ خود غرض علماء کی ملی بھگت۔

۳۔ عوام الناس کی دین سے لاعلمی۔

قرآن میں چار ادوار کا ذکر آیا ہے یعنی آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ اور عمرانؑ۔ اس مضمون کے حوالے سے ہم تیسرے دور لیتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ ایک بت پرست قوم میں پیدا ہوئے۔ لیکن وہ بچپن ہی سے بتوں سے نفرت کرتے۔ میں بے کار مورتیاں سمجھتے۔ جب جوان ہوئے، تو ایک دن شہر کے بڑے مندر میں جا کر سب چھوٹے بت توڑ پھوڑ یئے اور پھر تبر (کلہاڑی) ایک بڑے بت کے کندھے سے لٹکا کر خود چپکے سے غائب ہو گئے۔ تاہم بت پرستوں نے نفرت ابراہیمؑ کو ہی مورد الزام ٹھہرایا۔ تمام لوگ آگ بگولہ ہو گئے۔ آپ کے باپ نے بھی آپ کو بہت سمجھایا کہ

دیوتاؤں کی بے حرمتی بہت بڑا گناہ ہے اور اس کی بڑی سخت سزا ہوا کرتی ہے۔ لیکن خدا کا وہ پسندیدہ بندہ ایسی فضول باتیں کب مان سکتا تھا۔ آخر کار حاکمِ وقت کے حکم کے مطابق آپ کو آگ میں ڈالے جانے کا فیصلہ ہوا۔ آگے چل کر آپ کو امرِ ربی ہوا کہ آپ اپنے بڑے بیٹے اسمٰعیلؑ کو ساتھ لیتے ہوئے فاران کی وادی کو جائیں۔ وہاں بے آب و گیاہ مقام پر تمام انسانیت کے امن و سکون کا ایک مرکز قائم کریں۔ چنانچہ تمام دشواریوں کے باوجود آپ نے ایسا کر دکھایا اور اس کامیابی پر اپنے مہربان خدا سے امام الناس کا عظیم لقب بطور انعام پایا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دو صالح بیٹے عطا فرمائے تھے۔ ایک کا ذکر تو اوپر آچکا ہے' دوسرے حضرت اسحاقؑ تھے۔ آپ چھوٹے تھے۔ اہلِ یہود و نصاریٰ صرف انہی پر ایمان رکھتے ہیں۔ دورِ ابراہیمیؑ کے آخری نبی حضرت یوسفؑ تھے۔ آپ خدا کی مدد سے ملک کنعان سے مصر کی سرزمین میں پہنچے اور فرعونِ مصر کے وزیرِ اعظم اور کلی اختیارات کے مالک ٹھہرے۔ آپ کا زمانہ تواریخ کا سنہری باب ثابت ہوا۔

حضرت یوسفؑ کی وفات کے بعد سلسلۂ نبوت میں قدرے وقفہ آیا۔ پھر آپ ہی کی نسل سے حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا۔ لہٰذا اسی مناسبت سے دورِ عمران کا آغاز ہوتا ہے جو حضرت عیسیٰؑ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ خدا کی حکمت ملاحظہ فرمائیے کہ جس بچے کے ہاتھوں دورِ فرعون نے اپنے انجام کو پہنچنا تھا اس نے قصرِ فرعون ہی میں شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ پرورش پائی۔ تاہم آپ اپنی قوم بنی اسرائیل کے لئے جو فرعون کی غلامی میں مظلومیت کی زندگی گزار رہی تھی' اپنے دل میں نرم گوشہ ضرور رکھتے تھے۔ عہدِ شباب میں اسی قومی ہمدردی کے جذبہ کے تحت ایک بنی اسرائیلی کو ایک قبطی کے ظلم و ستم سے چھڑانے کے دوران اس قبطی کو ایک گھونسہ مارتے ہیں اور وہ کم بخت وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ملکی قانون کے خوف سے جہاں ہر قبطی کے قتل کا بدلہ قتل تھا۔ آپ ملک مصر سے فرار ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے۔ چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد آپ کو کوہِ طور پر نبوت سے نوازا جاتا ہے۔ آپ اپنے خالق حقیقی سے براہِ راست احکامات حاصل کرتے ہیں اور کلیم اللہ کے خطاب سے سرفراز ہوتے ہیں۔ اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا شریکِ کار بنوا لینے کے بعد اپنے مشن پر مصر واپس آتے ہیں۔ فرعون اور اہلِ فرعون کو خدا کے دین پر قائم ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ سعیٔ بسیار کے باوجود جب فرعون دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے' تو پھر آپ فرعون سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ قوم بنی اسرائیل کو آپ کے ہمراہ ملک مصر سے چلے جانے کی اجازت دے دے۔ اس بدبخت نے اجازت کیا دینی تھی۔ حضرت موسیٰؑ ایک رات اپنی قوم کو ساتھ لیتے ہوئے رضائے الٰہی کے مطابق دریا پار کر گئے۔ جب کہ فرعون اور اس کا لشکر آپ کا تعاقب کرتے ہوئے اسی دریا میں اور اسی مقام پر غرقاب ہو گیا۔

توریت شریف پہلی الہامی کتاب ہے جو حضرت موسےٰؑ کو کوہِ طور پر دی گئی۔ اس میں قوم بنی اسرائیل کو مخاطب

کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ تمہیں فرعون کی بدترین غلامی سے نجات دلوائی گئی ہے۔ اب تم خدا کا شکر بجالاؤ اور اس دین پر قائم ہو جاؤ جو تمہارے نبی کے ذریعہ تم تک پہنچایا گیا ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا، تو مصر کے تمام محلات اور باغات تمہاری میراث میں ہوں گے۔ مگر یہ قوم بڑی بدبخت اور کج رو ثابت ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ کی موجودگی میں ہی کفر اور شرک کی بار بار مرتکب ہوتی رہی۔ بار بار سزائیں پاتی رہی۔ پر اپنی سرشت سے باز آنا تھا نہ آئی۔ حضرت موسیٰؑ کے دار بقا کو کوچ کر جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس قوم کے مذہبی پیشواؤں نے حاکمانِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے توریت شریف کے اٹل اور مبنی بر حقیقت احکامات میں تحریفیں کرنا شروع کر دیں اور اس خود تراشیدہ شریعت کو خدا اور نبی کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایک روایتی مسلک بنا ڈالا اور اسی کو نافذ کرتے ہوئے اللہ کے دین کو یہودی مذہب میں تبدیل کر دیا۔ بعد میں کئی ایک نبی تشریف لائے۔ اصلی دین کی طرف دعوت پر دعوت دیتے رہے۔ لیکن یہ بگڑی ہوئی قوم ہیرا پھیری سے باز نہ آئی۔ اس نے دین پر قائم ہونا تھا نہ ہوئی۔

بالآخر اللہ نے بنی اسرائیل کی طرف حضرت عیسیٰؑ کو اصلاح کنندہ بنا کر بھیجا۔ یہ ان کی طرف آخری نبی تھا اور ان کی اصلاح کی یہ آخری کوشش تھی۔ عیسیٰؑ نے اس قوم کے مذہبی پیشواؤں اور لوگوں کو جو پہلا خطبہ دیا، وہ کچھ یوں تھا:۔

"اے قوم بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف خدا کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ میں تمہیں توریت کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلاؤں، تمہیں خدا کے دین پر قائم کروں۔ میں بیمار بھیڑوں کا علاج کرنے آیا ہوں۔ مُردوں کو زندہ، اندھوں کو بینائی اور جنگجوؤں کو ہم رنگ کرنے آیا ہوں۔"

عوام جو توریت شریف کی حقیقی تعلیم سے بے بہرہ تھے تعجب اور انہماک کے ملے جلے جذبات سے عیسیٰؑ کو سن رہے تھے۔ جبکہ مذہبی پیشوا، کہنے کو جن کے پاس جنت کی کنجیاں ہوتی ہیں، غصہ سے لال پیلا ہو رہے تھے۔ آخر غضبناک ہو کر بول پڑے۔ "تم کل کے چھوکرے ہمیں وعظ و نصیحت کرنے آئے ہو، بند کرو یہ پند و نصیحت ورنہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔" وہ بھلا اپنی دل پسند شریعت کو کب چھوڑ سکتے تھے جس کی بدولت وہ دنیا کے سیاہ و سفید کو اپنے قبضۂ قدرت میں لئے ہوئے تھے۔

چنانچہ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے حق و باطل کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہر دنیاوی حکومت مذہبی پیشواؤں کے سامنے دوزانو ہو جاتی ہے۔ شاہ روم بھی بالآخر یہودی دباؤ میں آ گیا اور حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر لٹکائے جانے کا پروانہ جاری کر دیا۔ روایت پرست یہودی عموماً اور ان کے پیشوا خصوصاً خوش ہوئے کہ ایک بہت بڑی آفت سے نجات پائی جب کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری اور پیروکار اس عقیدہ کو لے کر بیٹھ گئے کہ ان کے نبی نے ان کے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر کے ان کے لئے فلاح کا دروازہ کھول دیا۔ تاہم قرآن مجید نے ان دونوں عقیدوں کی واضح

الفاظ میں تردید کر دی۔

یہودیوں کی طرح حضرت عیسٰیؑ کے پیروکار بھی آپ کے بعد آپ کی تعلیمات سے سابقہ اُمتوں کی طرح آہستہ آہستہ ہٹتے گئے۔ انجیل شریف میں ملاوٹ ہونے لگی اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اصلی کتاب دنیا سے ناپید ہو گئی۔ پھر چار مختلف راویوں نے حضرت عیسٰیؑ کی احادیث اپنے اپنے پیرائے میں جمع کیں اور چار مختلف اناجیل متی مرقس، لوقا اور یوحنا لکھ ڈالیں اور اس طرح خدا کے کلام کے حصے بخرے کر ڈالے۔

یہودیوں کی سخت اور شدید مخالفت کی وجہ سے عیسٰیؑ کے تابعین بھی خدا کے اصلی دین پر قائم نہ رہ سکے اور موسٰیؑ کی شریعت کو چھوڑتے ہوئے اور یہودی مذہب سے بیزاری کے بعد ایک نئے مذہب یعنی عیسائیت کی طرح ڈال دی۔ اب یہاں سے یہودی پیشوائیت کا زوال اور عیسائی پوپ کا عروج شروع ہوتا ہے۔ ہاں تو اس طرح یہ دونوں امتیں دینِ واحد کو چھوڑ کر اپنے اپنے خود ساختہ مذہب و مسلک سے چمٹ کر رہ گئیں۔

تقریباً چھ سو سال تک دنیا پر پوپ کی بادشاہی قائم رہی۔ یہ دَور ظلم اور ناانصافیوں کا دَور تھا۔ پوپ کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ اس کے ادنیٰ اشارہ پر سر قلم کر دیئے جاتے تھے۔ بادشاہ بنتے بھی تھے اور ان کے سر تن سے جدا بھی کر دیئے جاتے تھے۔ گویا اس دنیا میں وہ تمام خدائی اختیارات کا مالک تھا۔ نہ صرف اس دنیا کا مالک، و مختار بلکہ اگلی دنیا کی کامیابی کے لئے جنتی پروانے بھی باضابطہ جاری کرتا تھا۔ بے شک یہودیوں کی پیشوائیت بھی انسانیت کے لئے ایک عذاب تھی مگر پوپ کی پیشوائیت عذاب سے بڑھ کر قیامتِ صغریٰ ثابت ہوئی۔

یہودیت اور عیسائیت کی خود تراشیدہ شریعتوں اور جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں کے درمیان روشنی کی ایک قندیل بلد ابراہیمیؑ (مکہ مکرمہ) میں روشن ہوئی۔ اس کی چکاچوند میں سابقہ تمام خود ساختہ شریعتیں اور مذاہب ماند پڑ گئے۔ اسی روشنی کے مینار کا اسمِ گرامی محمدؐ تھا۔ فرمانِ یزدانی جاری ہوا کہ اے محمدؐ! آج میں نے پر نبوت، کتاب اور دین (ضابطۂ حیات) مکمل کر دیا۔ آگے بڑھو اور میرے اس مکمل ضابطۂ حیات کو باقی تمام انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے ضوابط پر حاوی کر دو، چاہے تمہارا یہ عمل ان کو (مشرکین کو) کتنا ہی برا کیوں نہ لگے

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳) ○ اور اگر کوئی آڑے آئے تو تلوار اٹھاؤ اور میرے اس حکم کی تعمیل کرو۔

یقتلون فیقتلون

تاکہ زمین پر خدا کی بادشاہت قائم ہو جائے کیونکہ وہی ربِ واحد ہے اور اسی نے سب مخلوق کے پالنے کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔ یعنی قرآنی الفاظ میں وہ رب العالمین ہے۔

ہر ضابطۂ حیات کو قائم کرنے کے لئے منشور اور آئین کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ خدائے حکیم نے اپنے آخر

پیغمبرؐ کو رحمت اللعالمین کا خطاب عطا فرماتے ہوئے ایک منشورِ عظیم و بے مثال سورۂ فاتحہ کی شکل میں دیا۔ اب غور فرمایئے! خدا خود کو رب العالمین اور اپنے حبیبؐ کو رحمت اللعالمین کیوں کہتے ہیں؟ اس نکتہ کو اگر سمجھ لیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل اسی منشور کو من و عن قائم کرنا تھا اور قائم کرنے کے لئے آئین و دستور قرآن کی شکل میں نازل فرمایا گیا۔ اسی منشور اور آئین کو ملا کر دین یعنی ضابطۂ حیات بنتا ہے اور اس ضابطۂ حیات کی ابتدائی کڑی (بنیادی جمہوریت) نظامِ صلوٰۃ ہے جس کو قائم کرنا تھا، پڑھنا نہیں تھا (اقیموا الصلوٰۃ)۔ اس کی مختلف بندشوں پر غور کرنے سے ہر مسلمان اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ ہمارے دین (ضابطۂ حیات) کی ایک مشہود شکل ہے (MODEL) یعنی ہر بنیادی اکائی کا ایک امیر، جس کو عرفِ عام میں امام مسجد کہتے ہیں، اکثریت و اہلیت کی بنیاد پر منتخب ہوتا ہے۔ پھر یہ منتخب امیر اپنی صوابدید پر باعلم و باعمل افراد کی ایک مجلسِ مشاورت مقرر کرتا۔ اپنی اکائی کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کرتا۔ تمام ضرورت مندوں کی ضرورتیں اور دوسرے فلاحی کاموں کو پورا کرنے کے لئے نظامِ صلوٰۃ کا دوسرا اور انتہائی اہم پہلو یعنی نظامِ زکوٰۃ قائم کرتا کیونکہ مالی وسائل کے بغیر کوئی تدبیر، کوئی سکیم پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ زکوٰۃ کا کام صرف امام مسجد (امیر جماعت کی شکم پُری تک قطعاً محدود نہیں تھا۔ بلکہ ان نظاموں نے قرآن اور سنتِ نبویؐ کی روشنی میں ہر اکائی کی ہر احتیاج اور ضرورت کو بہتر اور موزوں طور پر پورا کرنا تھا۔

تیرہ سال کی صبر آزما تبلیغ اور صلہ رحمی کے باوجود جب کفارِ مکہ اپنی ضد اور جاہلانہ تشدد سے باز نہ آئے تو مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم نازل ہوا۔ محمدؐ خدا کا بندہ و رسول فوراً اپنے گھر کے بُت کو توڑتے ہوئے عازمِ مدینہ ہو گئے۔ وہاں خدا کی مدد سے حالات سازگار تھے۔ مسجدِ نبویؐ تعمیر ہوئی اور خدا کے دین کو قائم کرنے کے لئے حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہ عہدِ زرّیں خلیفۃ الرسول حضرت علیؓ تک قائم رہا۔ آپ کی شہادت کے بعد دینِ واحد میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں۔ اقتدار کے طالب افراد نے دین کو اپنی سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اپنے اقتدار کو طول دینے کی غرض سے دین کو سیاست سے علیحدہ کر دیا گیا۔

حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو جو نصیحت کی وہ کچھ اس طرح پر تھی۔

"آپ ہمارے نبیؐ کی اولاد ہیں۔ آپ ہمارے امام ہیں۔ قابلِ احترام ہیں۔ عزت کا جو مقام آپ کو اللہ نے دیا ہے وہ بلند و بالا ہے۔ آپ اپنے نانا جانؐ کے دین کی تبلیغ میں لگے رہیں اور ہم جیسوں کو سیاست کی پراگندگیوں میں چھوڑ دیں جہاں انسان کی عزت ہر لمحہ داؤ پر لگی رہتی ہے۔"

وہ دن اور آج کا دن، دین اور سیاست کو الگ الگ کر دیا گیا۔

اسی لئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس طرح دینِ قیّم دو جدا جدا اداروں میں بٹ کر رہ گیا۔ ایک مذہبی اور دوسرا سیاسی، ایک نجی اور دوسرا سرکاری۔ انگریزی جمہوریت میں ان دو اداروں کو پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر کہہ کر پکارتے ہیں۔ ویسے تو مسلمانوں کی سینکڑوں حکومتیں بنیں اور بگڑیں لیکن اسلامی حکومت جس میں خالصتاً اسلامی منشور و آئین رائج ہوتا آج تک نہ بن سکی۔ مغربی ممالک میں تو مذہب کو پہلے ہی سے ایک نجی حیثیت دے دی گئی ہے اور اب یہ بلے دینی فلسفہ ہمارے ہاں بھی اکثر جھاڑا جاتا ہے۔ اس میں سوشلسٹ خیالات رکھنے والے لوگ پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔

دین جب سیاست سے جدا ہو گیا، تو دین کے پرچارک امام کہلائے اور سیاست کے علمبردار امیر۔ امامت اور امارت کی پہلی اور آخری ٹکر کربلا میں ہوئی اور اس خون آشام واقعہ کے بعد امامت نے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا اور اپنی تمام تر توجہ محراب و منبر تک محدود کر دی۔ اُمیّہ دور میں امامت کو دبا کر رکھا گیا۔ بعد میں عباسیہ والوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے اپنی حکمتِ عملی (POLICY) کو قدرے بدلا۔ امامت کو ایک حد تک اور وہ بھی سیاست سے دُور رہ کر کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اتنے لمبے عرصہ کے بعد جب بند ٹوٹا تو امامت کے دریا میں ایک سیلاب اُمنڈ آیا۔ پانی بالکل گدلا ہو گیا۔ کوئی چیز صاف دکھائی نہ دیتی۔ مختلف اہلِ علم حضرات نے اپنے فہم و تدبّر کی بساط کے مطابق لیکن سیاست سے پہلوتہی کرتے ہوئے دین کے متعلق بہت کچھ کہہ ڈالا۔ باریک سے باریک تر نقطے ڈھونڈنے میں لگے رہے۔ دینی علوم کے اسی مشاغل و مجالس میں ہر حضرت نے اپنا اپنا ایک حلقۂ اثر پیدا کر لیا۔ اب وہ اسی کے رسوم اور عقائد کے پرستار بن بیٹھے ایسے میں مختلف دینی مسائل میں اختلافات اٹھنے لگے۔ ہر ایک نے اپنے ہی نقطۂ نظر کو ٹھیک اور درست ماننے پر زور دیا۔ بڑے بڑے مناظرے ہوئے، خونیں جھگڑے ہوئے۔ عباسیوں نے اپنی حکمتِ عملی کے مطابق ان فسادات پر مزید تیل چھڑکا تاکہ عوام اپنے دور از کار مسائل میں اُلجھے رہیں اور خلافتِ عباسیہ کے برخلاف کوئی متفقہ امامت سر نہ اٹھا سکے۔ ان کی سوچ اور تدبّر نے بالکل ٹھیک کام کیا اور خاندانِ عباسیہ پانچسو سال تک حکمرانی کرتا رہا۔ ان پانچ لمبی صدیوں میں عباسی، دین کے ہر فرقے کو تقویت دیتے رہے تاکہ ہر لوہ اپنی اپنی جگہ پر آسودہ رہے۔ چنانچہ دینِ واحد مختلف مذاہب میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور ہر مذہب والے اپنے مسلک کا ڈور کو سرورِ کائناتؐ کے مبارک قدموں تک پہنچانے کی سعیٔ لاحاصل کرتے رہے ورنہ قرآن میں تو اللہ تعالیٰ کی صریح تنبیہہ موجود ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ

وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ (۳۲-۳۱/۳۰)

اُور (دیکھو ہرگز) مشرکوں میں سے نہ ہو جانا، اور یہ وہ لوگ ہیں) جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور الگ الگ گروہ بن گئے۔ (اب) ہر گروہ اس (نصب العین) سے خوش ہے جو اس کے پاس ہے۔"

اور یوں دینِ متین میں مسلک و مذاہب در آتے۔ ان مذاہب کے بارے میں ایک عظیم مفکر نے اپنے فکر کی مندرجہ ذیل الفاظ میں ترجمانی کی ہے:۔

"دنیا کی سب مسلم اور مروّج اشیاء میں سے سب سے بڑا راز مذہب ہے۔ یہ 'پوجنا' 'پوجنا' کیا ہے؟ یہ جھکنا کیوں ہے؟ یہ رسمی عقائد اور شرعی مراسم 'یہ برہمن کے قشقے اور بُت پرست کی مورتیاں، مسلم کی قربانیاں، ہندو کے چڑھاوے کیوں ہیں؟ گبر کی شعلہ نوازیاں کیوں ہیں؟ عیسائی کا 'ابنِ خدا' کیا ہے؟ تسبیحوں کے ہار، حج کے مناسک، جاترے، نماز، تپتیا، پن دان، خیرات، صدقات، نذر نیاز، لمبی داڑھیاں، متشرع چہرے، تعویذ، اصطباغ، ہون، اشنان وغیرہ وغیرہ سب مذہبی مراسم مشق و رواج کے وہ اسرار جاریہ ہیں کہ ان کی علم تک پہنچنا عوام کے نزدیک کچھ ضروری نہیں۔ بایں ہمہ ہر شخص ان کو نہایت عقیدت اور التزام سے کرتا ہے۔ ان کے سچ یا جھوٹ، روا یا ناروا ہونے کے متعلق ایک حرف زبان پر نہیں لاتا۔ جاہل اور عالم، کم فہم اور عاقل سب اسی مشقِ نامعلوم میں حصہ لے رہے ہیں، اور ان کو حسبِ توفیق نباہتے رہنا زندگی کا نہایت اہم سمجھتے ہیں۔ انسان کی تمام داستانِ فرض و یقین میں، نہیں بلکہ اس کی اکثر روئیدادِ سعی و عمل میں مذہب ہی وہ ہمہ گیر اور خاموش عامل ہے کہ اس کا حیرت انگیز اثر کم و بیش ہر فرد پر نمایاں ہے اور مذہب وہ بحث سے منعک، حیطۂ دلیل سے خارج اور اب وجد کی وہ ارثِ متواتر ہے کہ ہر شخص اس پر بلے چون و چراں قابض رہنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔

تعجب ہے کہ مذہب کی طرف اس عام میلان کے باوجود ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ قطعی فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون سا مذہب سچا ہے، کونسا شارعِ کائنات کے منشا کے عین مطابق ہے، مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے، نہیں بلکہ خود مذہب کیا شے ہے اور اس کا مقصود بالذات بعینہٖ کیا ہے۔ سکونِ زمین کے متعلق ارسطو کے غلط

مذہب کا آج ایک پیرو نظر نہیں آتا، اگلے وقتوں کے سب غلط علمی نظریے فنا منسیا ہو ہو چلے ہیں، لیکن ہندو اور بدھ، گبرو برہمن، عیسائی اور مسلمان کے درمیان اختلاف بدستور قائم ہے! مذہب کو ساکنانِ زمین نے کیوں ایسی شئے فرض کر لیا ہے کہ اس کی سچائی کے مابین یہ بُعد المشرقین قائم ہے؟ صداقت کی جامع الناس کیفیت کیوں ان سب کو کسی مشترک حقیقت پر جمع نہیں کرتی؟ یہ کیوں ہے کہ سب کی نظروں میں اپنا مذہب سچ ہے اور باقی سب غلط ہیں۔ اگر سب اپنی اپنی جگہ سچ ہیں تو اختلاف کیوں ہے اور جب اختلاف قائم ہے تو سچائی کا ادعا کیا ہے؟"

الغرض قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ نوحؑ کی قوم اور بعد کی آنے والی تمام قوموں نے خدا کے دین کو ٹھکرایا اور اس دین کے پہنچانے والوں کو ساحر اور مجنون کے القاب دیئے اور ان کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔ البتہ قوم بنی اسرائیل وہ پہلی قوم ہے جس نے دینِ موسےٰؑ کو صرف ٹھکرایا ہی نہیں بلکہ اس دینِ واحد کو بدل کر یہودی مذہب میں ڈھال دیا۔ اُن کی اصلاح کے لئے حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے لیکن اس بدبخت قوم نے آپ کو بھی پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا۔ یہودی پیغام عیسوی جو درحقیقت خدا کا پیغام تھا، ہرگز نہ مانے اور حضرت عیسےٰؑ کے اُٹھ جانے کے بعد آپ کے حواریوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ان کے غیض و غضب سے تنگ آ کر یہ ستم رسیدہ لوگ حبشہ، مصر اور یورپ کی طرف ہجرت کر گئے اور وہاں اپنے عقیدہ کی تبلیغ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور یہودی مذہب سے ہٹ کر انہوں نے اپنے عقیدہ کو عیسائیت کا نام دے دیا یعنی حضرت عیسےٰؑ کی تعلیمات پر چلنے والے۔ یہ لوگ اپنے نیک اعمال کی بدولت بہت کامیاب ہوئے اور اپنے نئے مذہب کو کافی پھیلایا اور اُسے پھیلنا چاہیئے بھی تھا کیونکہ ان علاقوں میں بُت پرستی اور آتش پرستی کا رواج عام تھا۔ تو گویا اس طرح اللہ کے دین (اسلام) میں مختلف مذاہب نے جگہ پائی۔ پہلا مذہب یہودیت بنا اور دوسرا عیسائیت۔ چونکہ یہ دونوں مذاہب والے حضرت حضرت ابراہیمؑ کو مانتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مذاہب کی نفی فرماتے ہوئے قرآنِ مجید نے صاف طور پر کہہ دیا۔ ابراہیمؑ یہودی تھے نہ نصرانی (عیسائی)۔ وہ صرف مسلمان تھے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۝ (۳/۶۷)

کم و بیش چھ صدیوں کے بعد سرورِ دو عالمؐ نے تمام کفار کو عام طور سے اور یہود و نصاریٰ کو خاص طور پر دعوتِ اسلام دی اور فرمایا کہ آپؐ ان سب کو دینِ ابراہیمی کی طرف بلا رہے ہیں لیکن بہت تھوڑے لوگوں نے لبیک کہا جب کہ بڑی اکثریت اپنے باپ دادا کے غلط مذاہب اور عقیدوں پر قائم رہی ہے۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ

گزرا نہیں تھا کہ امتِ محمدیؐ بھی اقوامِ سابقہ کی طرح مذہبی اور گروہی عصبیتوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔ یہ امتِ واحدہ پہلے دو لخت ہوئی یعنی شیعانِ علیؓ اور غیر شیعانِ علیؓ۔ بعد میں ایک تیسرا گروہ بھی پیدا ہوا جس کو خوارج کا نام دیا گیا۔ یہ بیماری بڑھتی ہی چلی گئی۔ ان تینوں گروہوں کے مابین الجھنیں قائم رہیں۔ حتیٰ کہ امیہ دور میں کربلا کا خونین المیہ واقعہ ہوگیا۔ کاش یہ بدنصیب گھڑی ٹل جاتی کیونکہ اس نے عالمِ اسلام کو بہت زچ کیا اور ابھی تک کر رہا ہے۔ اسی اندوہناک واقعہ کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اپنی کتاب "انسانیت موت کے دروازے پر" میں لکھتے ہیں کہ کربلا کے سانحہ نے مسلمانوں کے مابین خون کی ایک ایسی لکیر کھینچ دی ہے جو قیامت تک مٹائی نہ جاسکے گی۔

امیہ اپنے دَور کے ابھی سو سال پورے نہ کر پائے تھے کہ بنو عباسیہ نے ان کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ یہ بھی تواریخ کا ایک خون آشام واقعہ ہے۔ بہرکیف یہ دور اپنی خامیوں کے باوجود خلافت راشدہ کا ایک موہوم اثر اپنے اندر ضرور رکھتا تھا۔ اس عہد میں مسلمانانِ عالم اپنے امیر کی اطاعت جزو ایمان سمجھتے تھے۔ ایک امام اور ایک مسجد میں اکٹھی نماز ادا کرتے۔ حدیث و فقہ کی تدوین ابھی تک نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی علمِ قرأت وضع کیا گیا تھا اور نہ ہی روایتی قسم کے امام صاحبان مساجد میں متعین تھے۔ گویا اس دَور میں امامت اور امارت ایک تھی۔ عام مسلمانوں کے اسی جذبۂ عقیدت و احترام سے کام لیتے ہوئے عمر بن عبدالعزیزؒ (خلیفۂ بنو امیہ) نے عہدِ فاروقی کی طرف لوٹ آنے کی بھرپور کوشش فرمائی۔ لیکن تین سال پورے کرنے سے پیشتر ہی زہر دے کر شہید کر دیئے گئے۔

بنو امیہ کے زوال کے بعد بنو عباس کا دَور شروع ہوا۔ ان کا سورج تقریباً پانچ صدیوں تک چمکتا رہا۔ اسلامی تواریخ میں اس عہد کو عہدِ زرّیں بھی کہتے ہیں اور علوم و فنون کا گہوارہ بھی۔ اسی دور میں امام بخاری پیدا ہوئے اور اسی میں امام مسلم وغیرہم۔ یہ سب حدیثِ نبویؐ کے امام مانے جاتے ہیں۔ جب کہ اسی زمانہ میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام حنبلؒ بھی منظرِ عام پر تشریف لائے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی فقہ ترتیب دی جن پر ہر امام کے پیروکار آج تک عمل پیرا ہیں۔ پاکستان، ہندوستان، افغانستان اور ترکیہ ان چار ممالک میں اکثریت امام ابوحنیفہؒ کے پیروکاروں کی ہے جب کہ باقی لوگ امام شافعیؒ کے معتقد ہیں اور عرفِ عام میں اہل حدیث کے نام سے مشہور ہیں۔ ان ہر دو فریق کی فقہ بھی علیحدہ علیحدہ ہے اور مساجد بھی۔ اسی طرح ان ممالک میں شیعانِ علی بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کی اپنی فقہ، فقہ جعفریہ ہے۔ ان کی مساجد بھی جدا ہیں۔ تاہم ان میں پانچ وقتہ نماز باجماعت کا اہتمام نہیں۔ یہ فرقہ اپنے پیش امام کو امام نہیں پکارتے بلکہ مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک امامت بہت محترم ہے اور امام خمینی جیسی باعمل شخصیت کو امامِ وقت تسلیم

کرتے ہوئے اس کے احکامات پر لبیک کہتے ہیں۔

اس قسم کی فرقہ بندی خلافتِ راشدہ میں تھی نہ امیہ دور میں۔ امتِ واحدہ میں یہ مذہبی آزادی بنو عباسیہ نے اپنے عہدِ سلطنت میں دی اور کیوں دی؟ درحقیقت مسلمان دین کے معاملہ میں بڑے حساس ہیں۔ ان کے اسی جذبہ نے بنی امیہ کو تختِ خلافت سے اتارا اور بنو عباسیہ کو اس تخت پر بٹھلا دیا۔ حضرت عباسؓ جناب رسول اکرمؐ کے چچا تھے۔ حضرت عباس کی اولاد میں سے دو شیر دل جوان پیدا ہوئے۔ ایک کا نام ہاشم اور دوسرے کا نام منصور تھا۔ پہلا تلوار کا دھنی اور دوسرا زیرک و دانا سیاستدان تھا۔ ان دونوں نے مل کر کامیاب منصوبہ بنایا۔ بنی ہاشم کو مظلوم اور بنی امیہ کو ظالم ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ اس میں دوسرے مظالم ایک ایک کر کے گنوائے اور واقعۂ کربلا کو سرِفہرست رکھا اور یہ باور کرایا گیا کہ کربلا میں سرورِ کونینؐ کے خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا ارادہ کئے ہوئے تھے اور یہ محض ایک اتفاق تھا کہ امام زین العابدینؒ بیمار پڑ گئے اور کربلا کی جنگ میں حصہ نہ لے سکے ورنہ وہ بھی شہدائے کربلا میں شامل ہو جاتے۔ پھر کیا تھا مسلمان بپھرے ہوئے شیروں کی طرح بنو امیہ پر ٹوٹ پڑے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ فتح کے بعد پہلا خلیفۃ المسلمین ہاشم بنا لیکن وہ کچھ ہی عرصہ بعد فوت ہو گئے اور ان کی جگہ المنصور خلیفہ ثانی مقرر ہوئے اور آپ ہی بنو عباسیہ کے بانی مانے جاتے ہیں۔

مسندِ خلافت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے اپنی حکومت کے نظم و نسق کو درست کیا اور پھر اپنی کامیابی اور بنی امیہ کی تباہی کے اسباب پر غور و خوض شروع کیا۔ چونکہ بلا کا زیرک، معاملہ فہم اور مدبر تھا جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچا کہ خاندانِ بنو عباسیہ کی حکومت کو دیرپا استحکام صرف ایک ہی صورت میں مل سکتا ہے کہ سیاست کو دین سے علیحدہ کر دیا جائے۔ سیادت حکمرانوں کا شعبہ ہو اور مذہب علماء و مشائخ کا۔ اہلِ سیادت ملکی سیاست کو سنبھالا دیں جب کہ اہلِ علم حضرات محراب و منبر کو زینت بخشیں اور سیاست سے دور رہیں۔ المنصور نے یہ پالیسی مرتب کی اور اس پر سختی سے کاربند ہوا۔ اہلِ علم اور مذہبی علوم سیکھنے والوں کے لئے بغداد میں متعدد درسگاہیں بنوائیں۔ دور دراز علاقوں سے جید علماء بلواتے اور درس گاہوں میں اچھی اچھی ملازمتیں دیں۔ علمائے قرآن اور حدیث پر درس دینے شروع کر دیئے۔ ملکی معاملات سے تعرض ممنوع تھا۔ لہٰذا ان اہلِ علم حضرات نے اپنی تمام تر توانائیاں زیر و زبر پر خرچ کرنا شروع کر دیں۔ بڑے بڑے مناظرے ہوتے۔ بحث و مباحثے ہوتے۔ ہمعصر علماء صاحبان میں مختلف آراء کی وجہ سے اختلاف پیدا ہونے شروع ہوئے۔ محاذ آرائی تک بھی بات پہنچی۔ رفتہ رفتہ چار مسالک اہلِ سنت حضرات کے اور پانچواں اہلِ تشیع کے قائم ہو گئے۔ بنی عباسیہ کا مقصد برآیا حکومتِ وقت نے پانچوں مسالک کی پیٹھ ٹھونکی اور اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے لگے کہ اب مسلم امہ بنو عباسیہ کے

برخلاف کبھی متحدہ محاذ نہ بنا سکیں گے۔ ان کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ ہاں کبھی کبھار کوئی ایک امام حکومت کی مرضی کے خلاف کچھ کہہ دیتا تو بڑی سخت سرزنش ملتی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتیں۔ اس مکارانہ پالیسی کے طفیل بنو عباسیہ پانچسو سال تک حکومت تو کر گئے لیکن امتِ واحدہ کو ہمیشہ کے لئے ٹکڑے ٹکڑے کر گئے اور پھر قدرت کا انتقام ملاحظہ ہو کہ جس حربے سے (DIVIDE AND RULE) بنو عباسیہ اپنے عہد کو دوام دینا چاہتے تھے، وہی عوامل ان کے برخلاف حرکت میں آئے۔ ہوا یہ کہ بنو عباسیہ کا جو آخری خلیفہ تھا حکومت پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اتنے میں دو مسالک میں سخت ٹھن گئی۔ ان میں سے جس کی افرادی قوت قدرے کمزور تھی، خفیہ طور پر اس نے ہلاکو خاں کو بغداد پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے دی۔ پھر کیا تھا، ہلاکو خان آندھی کی طرح آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ خلیفہ رہا نہ دورِ بنو عباسیہ۔

آیئے قرآن شریف پڑھیں

بزمِ ندائے مسلم کا انمول تحفہ

ایسے خواتین و حضرات جو بچپن میں کسی وجہ سے قرآن پاک نہیں پڑھ سکے یا پڑھ کر بھول گئے ہوں تو آیئے قدم بڑھائیں، ہمارے اسباق بلا معاوضہ منگوا کر گھر بیٹھے قرآن پاک ناظرہ پڑھنا سیکھیں اور دین و دنیا کی برکتیں حاصل کریں۔ اسباق کامیابی سے مکمل کر لینے پر خوبصورت سند بھی دی جاتی ہے۔ جوابی لفافہ کے ہمراہ مزید تفصیلات کیلئے آج ہی رابطہ فرمائیں۔ (انچارج آیئے قرآن پڑھیں) بزمِ ندائے مسلم پاکستان I-B-3/8 ٹاؤن شپ لاہور۔ کوڈ 54770

بزمِ ندائے مسلم پاکستان I-B-3/8 ٹاؤن شپ لاہور

حافظ محمد یعقوب خاں تاجیک

پاکستان کی اقتصادی بہتری کے تقاضے

——— میرے ملک کی اقتصادیات اگرچہ (بفضلہ تعالیٰ) بہتر ہیں لیکن اقتصادی کاروائیوں کے ایسے تقاضے جو انسانی حاجتوں کے مطابق طے نہیں پا رہے اب بھی غور طلب ہیں۔

——— قومی دولت اور اس کی پیدائش اور اس کے مصارف پر مضمون آفرینی جب سے پاکستان بنا ہے ہو رہی ہے۔ اطلاع نامے بھی چھپ رہے ہیں۔ مالی معاوضوں اور معاہدوں کے اعلانات کی بھی کمی نہیں لیکن معلومات کی اس ساری صنعتی، تجارتی، مالی سرگرمی میں اس اضطرار سے اعراض برتا جاتا ہے جو قوم کی معاشیاتی افتاد کا موجب ہے۔

——— معروضی حالات، مشکلات، افتراق، افراط کتنی ہی چیزیں ہیں جن کی تشریح چاہیئے لیکن ان کی تفاصیل سے کام بن جائے گا؟ کیا روٹی دینے والا آج کا یہ "آقا" اپنی انا سے، اپنی فرعونیت سے، باز آجائے گا؟ اپنے دم سے کیا یہ کہے گا کہ جا للہ میں آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں۔

——— اقتصادی بہتری کے تقاضوں میں سب سے پہلا اور اہم تقاضا انسان کی پہچان ہے۔ انسان کے اس مقام کی پہچان ہے جو مقام خدائے قدوس نے انسان کے لئے متعین کیا ہے کیونکہ یہ انسان ہی ہے جو مل جل کر زندگی بسر کرنے کے لئے دولت کی پیدائش کرتا ہے اور دولت کی پیدائش جسے یہ اپنے گھر، اپنے قبیلے اور اپنی قوم کے لئے کرتا ہے۔ اس سے اس کے سلسلۂ نسب کے ساتھ انسانی وحدت وجود میں آتی ہے اور انسانی وحدت کے وجود میں آجانے سے انسان ہی ہے جو فلاح پاتا ہے اور ارض و سما کی ان تمام نعمتوں سے جو انسان کے اختیار اور اس کے تصرف کے قابل ہیں فیضیاب ہوتا ہے۔

——— اور انسانوں کے بسر اوقات اور اس کی ترقی کے لئے ایسے اقتصادی روابط، ایسے معاشی نظام اور ایسے معاوضوں کی ہمیشہ ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے جس میں انسانوں کی مشترکہ محنت کے ماحصل سے شاہ اور غریب کی

طبیعی ضروریات (جو فطری طور پر ایک طرح کی ہیں) جہاں پوری ہوں وہاں اعلیٰ قدروں کی پاسداری میں انسان کو آزادی کا یہ حق رہے کہ وہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے اپنے راستے کا انتخاب خود کرے اور اقتصادی قدر و قیمت اور کام کی اُجرت اپنی ضرورت کے مطابق پائے۔

——— لیکن جہاں فرائض اور ضروریات کے تذکرے ہوتے ہیں وہاں نفع ڈھونڈنے والوں کی ذہنی کیفیت آج تک وہی رہی ہے کہ گدائی کو فروغ دیا جائے، خدمت گار زیادہ پیدا کئے جائیں اور غربت کا وہ تناسب جو چلا آرہا ہے برقرار رکھا جائے۔

——— مترفین، مستکبرین، ظالمین (قرآن کریم کی اصطلاحات ہیں) کے رسوم و قواعد جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں جو اپنی سفاکی میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں، اپنی جابرانہ خصلت میں ان لوگوں کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دیتے جو معاشی بدحالی کی وجہ سے نادری حکم کرنے والوں کے گرد زندگی بسر کرتے ہیں۔

دولت کے نشے میں حق کی آواز کو دبا دینا (حالانکہ وہ آواز دبتی نہیں)۔ غربا کو دھتکار دینا، معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا، اقتصادیات کو بنیادی اور مساوی طور پر ترتیب نہ دینا، سرمایہ داری کو اپنی ہنرمندی کا نام دینا، انسانی حقوق کو غصب کرنا، بے گناہوں کو سزائیں سنانا، کام کرنے والوں کی کمائی پر اپنا وقت گذارنا، اللہ کے احکامات کی مخاصمت میں سرگرداں رہنا۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

——— اور جہاں یہ کیفیت رہے ——— نظامِ معیشت میں اپنے مقام، اپنی حیثیت، اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور بغیر کسی معقول وجہ کے دوسروں کو فائدہ پہنچانا ——— وہاں اقتصادی بہتری کے تقاضے کیا نہیں ہوں گے!

——— سود کے خاتمے کا سوچنا مگر سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کی بات نہ کرنا، زکوٰۃ کو مساویانہ اقتصادی فلسفہ کی علامت سمجھنا مگر غریبوں، ضرورت مندوں کی احتیاج اور افلاس کے مسئلہ پر مجالس میں خاموشی اختیار کرنا، بینکوں اور مالیاتی اداروں سے صاحبِ ثروت افراد کا اربوں روپے نکلوانا اور پسماندہ طبقے کو چار پیسے دے کر فرو مائیگی کا طعنہ دینا، ربٰو کا نام منافع رکھ کے بزرگانہ عنایت کرنا، غیر واضح معاشی اصطلاحات کی نشر و اشاعت کر کے حیلہ گری کرنا، لوگوں کی محنت کا معاوضہ ان کی محنت کی مثل ادا نہ کرنا، قومی وسائل کو شخصی ملکیتوں میں دے دینا، زکوٰۃ فنڈ کو انصاف کی رو سے تقسیم نہ کرنا، جاگیروں کا انفرادی ملکیت میں رکھنا، ٹیکسوں کی وصولی 'حلقۂ سرداری' کے افراد سے نہ کرنا، ملکیت کے تصور کو امانت کے تصور میں بدلنے کی کوشش سے بچکچانا، تعلیم جو عقل و شعور کو بیدار کرے اس سے عام لوگوں کو دور رکھنا، منافع اور کرایہ کے حصول میں اقتصادی استحصال کو صحیح قرار دینا، مالی وسائل کو مالدار طبقات سے محروم طبقات کی طرف

منتقل ہونے سے باز رکھنا' ایسے اقدامات ہیں جن سے قوم کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہوتی۔

یہ زمین اور یہ کائنات اللہ کی ملکیت ہے اور اللہ غنی بالذّات ہے۔

وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (آلِ عمران آیت ۱۸۰)

"اور اللہ وارث ہے تمام آسمانوں اور زمین کا۔"

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى

"اور اللہ کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو جو بُرے عمل کرتے ہیں ان کے کئے ہوئے عملوں کے مطابق بدلہ دے اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے ان کو ان کے اچھے کاموں کے عوض بدلہ دے۔"

(النجم۔ آیت ۳۰)

——— اور ارض کے تمام وسائل ہر ذی حیات کے لئے اللہ کی طرف سے عطیہ ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا

"تیرے رب کی عطا سے ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی اور تیرے رب کی یہ عطا کسی پر بند نہیں ہے۔" (بنی اسرائیل۔ آیت ۲۰)

——— اور ایسے ہی یہ مقامات ہیں جن کی وضاحت میں ایک اسلامی مملکت کی سپریم کورٹ کے ایک چیف جسٹس نے ایک جگہ لکھا تھا۔

(ترجمہ) "اسلام کے اقتصادی قوانین کے مطابق دولت کے تمام قدرتی ذرائع' چاہے وہ خشکی پر ہوں یا سمندر میں یا فضا میں' عام انسانوں کی ملکیت ہیں اور وہ کسی طرح کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔"

معاشرے میں مال کا وہی درجہ ہے جو انسان کے بدن میں خون کا۔ جس طرح خون کو ہر وقت بدن میں گردش کرتے رہنا چاہیئے اسی طرح مال کو بھی معاشرے کے سب طبقوں میں گردش کرتے رہنا چاہیئے تاکہ معاشرے کے سب افراد اس سے طاقت حاصل کرتے رہیں اور ہمیشہ چست اور مستعد رہیں۔

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے مال ذریعہ ہے زندگی کی بہبود کا۔ انسانی ضروریات پوری

کرنے کا، عوام کی حالت سنوارنے کا اور اعلائے کلمۃ اللہ کا۔"

ـــــ ملکی وسائل، تمام کے تمام، ربّ العالمین کی ملکیت ہیں۔ انسان ان کا امین ہے، مالک نہیں۔ لہٰذا مملکت کی تعمیر میں اقتصادی بہتری کے وہ تقاضے جو اسلامی نظامِ معیشت اور اس کی امتیازی خصوصیات کے نام پر ہو سکتے ہیں اختصار سے درج کر دیے ہیں۔ چند اور ہیں وہ بھی لکھے دیتا ہوں۔

ـــــ زائد دولت مستحق افراد کی ضرورت کے لئے لے لینا۔

ـــــ معاشی طبقات کے رجحانات کو روکنا۔

ـــــ مزارعین کو غلامانہ طرزِ عمل سے محفوظ کرنا۔

ـــــ زمین اور اس کے خزائن کے غاصبانہ قبضوں کو شریعتوں سے تحفظ دینے والوں کا محاسبہ کرنا۔

ـــــ غیر پیداواری اخراجات کم کرنا۔

ـــــ ملکی وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے عورت کی لاعلمی اور جہالت کو علم کی دولت سے کم کرنا۔

ـــــ کمزور عقل والی سیاست اور فرقوں والے مذہب جو استحصالی اور خلافِ انصاف جوڑ توڑ کا مرکز ہے (اور جس سے انسانی شعور کا دم گھٹتا ہے) کی گرفت کو کم کرنا۔ اور

ـــــ پیدا ہونے والے ہر انسانی بچے کی تعلیمی ضروریات مساوی طور پر تسلیم کرنا۔

(قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا۔ "پاکستان کا مستقبل اس بات پر منحصر ہوگا کہ ہم اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دیتے ہیں")۔

ـــــ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى اِلَّا وَ اَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ وَ مَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتُهَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر اس حال میں کہ ان کے رہنے والے ظالم ہوں اور جو چیز تم کو دی گئی ہے تو وہ دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔" (القصص۔ آیت ۵۹ ـ ۶۰)

حسین امیر فرہاد

توہینِ رسالت

۱۹۹۲ء میں ہمارے ہاں قانون بنا ہے کہ توہینِ رسالت کے مرتکبین کو سزائے موت دی جائے گی. بڑی اچھی بات
ہے. یہ ایک مستحسن قدم ہے, بلا شُبہ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

کیونکہ دین اللہ کی طرف سے ملتا ہے. لیکن امت کی تشکیل اس کے رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو
انسانوں تک پہنچاتا ہے اور اس کے مطابق معاشرے کی تشکیل کرتا ہے. اسی نسبت سے اسلام کے پیروکار اُمّتِ محمدؐیہ
کہلاتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم وہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ورفعنا لك ذكرك (انشراح؛ ۴) اور
فرمایا. عسیٰ ان یبعثك ربك مقامًا محمودا (بنی اسرائیل؛ ۷). آپ مقامِ محمود پر فائز ہوئے اور محمدؐ کہلائے.
لہٰذا توہینِ رسالت کے مرتکب کے لئے سزائے موت لازم ہے. مگر یہ بھی وضاحت لازمی تھی کہ توہین سے مراد کیا ہے ۔
اس سے ہر شخص من مانی مراد لے گا. پشاور سے اڑھائی میل پرے وہ علاقہ لگتا ہے کہ جہاں کوئی عدالت نہیں، جرگہ سزا دیتا
ہے. اس سے یہ خدشہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذہن کے مطابق معنی لے گا. بدقسمتی سے مزاج شناس رسول (مودودی
مرحوم) بھی نہ رہے تاکہ ان سے پوچھا جائے کہ کونسی بات توہینِ رسالت کہلاتی ہے کونسی نہیں. عشق ایک جذبہ ہے
جس میں یہ جذبہ ہو اسے عربی میں عاشق کہتے ہیں. جس کے لئے یہ جذبہ ہو وہ معشوق کہلاتا ہے. عشق علیٰ فلاں، فلانے پر
عاشق، محبوب، شیدائی، چاہنے والا. مستند لغات میں اس کا ترجمہ بھی یہ ہے. عاشق اور معشوق (LOVER SWEET-
HEART BELOVED -) اس جذبے میں جلے بھنے کو جو پتلا دُبلا ہو جاتا ہے تیلی اور چھڑی سے تشبیہ دیتے ہیں.
محبّت ہر صنف سے ہر چیز سے کی جاتی ہے. مگر عشق صنفِ مخالف سے کیا جاتا ہے. یعنی مرد عورت سے اور عورت مرد
سے. لہٰذا یہ کہنا جائز ہے کہ زید کو ماں سے محبّت ہے اور بکر کو بہنوں سے یا عمر کو گھوڑے سے مگر یہ کہنا بالکل ناجائز ہے کہ

زید کو ماں سے عشق ہے اور بکر کو بہنوں سے اور عمر کو گھوڑے سے۔ لہٰذا اگر ماں بہن سے عشق ناروا ہے تو رسول سے عشق کیسے روا ہو سکتا ہے؟ یہ تو اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں یحب اللہ، فلاں یحب الرسول یعنی فلاں کو اللہ سے محبت ہے اور فلاں کو رسول سے۔ لہٰذا میرے نزدیک اگر کوئی اپنے آپ کو عاشقِ رسولؐ کہے تو یہ توہینِ رسالت ہے لہٰذا واجب گردن زدنی ہے۔ عاشق کے متعلق یہ بھی یاد رہے کہ کویت میں ہماری کمپنی کے چیئرمین نے میرے توسط سے پاکستان سے ایک گھریلو خادم منگایا۔ جس کا نام عاشق تھا۔ چیئرمین کی بیگم نے مجھے بلا کر کہا کہ اس خادم کو واپس پاکستان بھیج دو۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ یہاں میرے ہاں میرے عزیز اور مہمان بھی آتے ہیں، میں اس خادم کو کس طرح کہوں گی۔ عاشق چائے لاؤ، عاشق پانی لاؤ، عاشق یہ کرو عاشق وہ کرو۔ لوگ کہیں گے شوہر کا فی نہ تھا عاشق بھی منگا لیا۔ بات معقول تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ آپ اسے حسین کے نام سے بلایا کریں۔ اس کا پورا نام عاشق حسین ہے۔ خادم کو بھی میں نے سمجھا لیا کہ اگر یہاں رہنا ہے تو حسین کے نام سے حرکت میں آیا کرو۔

گھریلو ملازم کو عاشق کے نام سے بلانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پاکستانی خاتون اپنے ملازم کو یار کے نام سے بلائے۔ لہٰذا عشقِ رسولؐ کا دعویدار توہین کا مرتکب ہے اور واجب گردن زدنی ہے۔

۱۴۔ فروری ۱۹۹۲ء کے پروگرام تفہیمِ دین جس کے میزبان پروفیسر حسنین کاظمی صاحب تھے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا جادو برحق ہے۔ جواب دیا مولانا فضل الرحمٰن ندوی صاحب نے کہ جی ہاں، جادو برحق ہے۔ خود حضورؐ پر اس کا اثر ہوا تھا۔ پھر اللہ نے سورۃ الفلق اور سورہ الناس نازل فرمائی۔ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے نبیؐ سے جادو کا اثر زائل کر سکتے تھے۔ مگر امتِ محمدیہ کو ہر بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے نبیؐ کو یہودیوں سے مسحور کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفارِ انبیاء کو مسحور، مجنون اور ساحر کہا کرتے تھے (دیکھئے آیت ۱۵۲ شعراء اور ۵۸ شعراء اور زاریات ۵۲) سحر کا لفظ عربی میں بات کو توڑ مروڑ کر کرنے اور لطیف انداز میں دھوکہ فریب دینے والا اور مسحور ہوا دھوکہ کھانے والا۔

نبیؐ کے لئے یہ دونوں صورتیں توہین آمیز ہیں۔ نہ وہ دھوکہ دیتا ہے نہ وہ دھوکہ کھاتا ہے۔ اور پھر بڑی شہادت اللہ کی ہے۔ وہ ان لوگوں کو گمراہ کہتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نبیؐ ساحر یا مسحور ہوئے۔ فرمایا۔

"جب یہ لوگ سرگوشیاں کرتے ہیں جب یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک ایسے شخص کی پیروی کرتے ہو جس پر سحر کیا گیا ہے۔ دیکھو انہوں نے کس طرح تمہارے متعلق باتیں بنائی ہیں۔ یہ گمراہ ہو رہے ہیں۔" (بنی اسرائیل آیت ۴۷۔ ۴۸)۔

دوسری آیت ملاحظہ ہو۔

"اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کرتے ہو۔ اے پیغمبر دیکھو یہ تمہارے متعلق کس کس طرح باتیں کرتے ہیں۔ یہ گمراہ ہو گئے اور راستہ نہیں پا سکتے۔" (سورہ الفرقان

آیت ۷ ۔ ۸ ۔ ترجمہ مولانا محمود الحسن مطبوعہ تاج کمپنی)۔

ان آیات کی موجودگی میں یہود اور گمراہ لوگ نبیؐ کو مسحور کیا کرتے تھے۔ مگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ٹی وی اور مولانا نے بھی حضورؐ کو مسحور کہتے ہیں۔ یہ کھلی توہینِ رسالت ہے۔ لہٰذا ان سب کا کام تمام کرنا چاہیئے۔

۲۔ دسمبر ۱۹۹۲ء کو پی ٹی وی سے صبح کی نشریات میں تلاوت کے بعد مولانا نے کہا کہ جب حضورؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ گھبرائے ہوئے گھر آئے۔ بیوی کو تمام ماجرا سنایا وہ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئی، جو ایک عیسائی عالم تھے۔ انہوں نے تمام کیفیت سننے کے بعد آپ کو خوشخبری سنائی کہ آپ تو نبی ہو گئے۔ کہا ایک وقت آئے گا کہ آپ کی قوم آپ کو ملک بدر کرے گی۔ کاش میں اس وقت ہوتا تو میں آپ کی مدد کرتا۔ اس واقعے سے عیسائیوں نے یہ ثابت کیا کہ ان کے نبی کو تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ انہیں نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ بھلا ہو ہمارے دین کا کہ انہوں نے بتایا ورنہ انہیں تو ساری زندگی پتہ نہ چلتا کہ وہ نبی ہیں۔ کمال کی بات ہے کہ حضورؐ منصبِ نبوت پر سرفراز فرمائے گئے، نہ اللہ نے بتانا مناسب سمجھا نہ جبرائیل نے انکشاف کیا۔ وہ خوشخبری دے رہا ہے کہ آپ کو نبوت ملی۔ یہ سراسر توہینِ رسالت ہے۔ اس کے مرتکبین کو سزائے موت ملنی چاہیئے۔ یہاں پشاور میں ٹیکنیکل کالج کے قریب ایک گندی نالی ہے جہاں ہر وقت لوگ بیٹھ کر پیشاب کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ چھینٹے اس دیوار پر پڑتے ہیں جس پر لکھا ہے،

"آزادی کے تین نشان، اللہ، محمدؐ اور قرآن" (اسلامی جمعیت طلباء)

یہ بھی اللہ کے رسولؐ اور قرآن کی توہین ہے۔ لکھنے والے قابلِ گردن زدنی ہیں۔

پان اور نسوار دونوں ایک ہیں۔ کیونکہ دونوں کے اجزائے ترکیبی ایک ہیں۔ یعنی تمباکو اور چونا۔ جس کے مُنہ میں پان یا نسوار ہو اور وہ اللہ رسولؐ کا نام لے یہ بھی توہین ہے۔ بعضی قابلِ گردن زدنی جرم ہے۔ مگر کچھ علماء منبر پر بیٹھ کر جگالی کرتے ہیں۔ جوشِ خطابت میں پان کے چھینٹے مقتدیوں پر پڑتے ہیں۔ منبر کے پاس ہی اگالدان رکھا ہوتا ہے اسے بھی سب کے سامنے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ (افسوس کہ پشتون مولوی اس FACILITY سے محروم ہیں)۔ یہ بھی توہین کے زمرے میں آتی ہے۔ ٹی وی پر انگریزی خبروں سے ذرا پہلے حدیث النبیؐ کے ساتھ لکھا آتا ہے۔ PROPHET SAYS۔ یہ لفظ PROPHECY سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں پیش گوئی کرنے والا۔ نبیؐ کو پیش گوئی کرنے والا کہنے والا بھی توہینِ رسالت کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس طرح آج کل انگریزی طبقہ اپنی تحریر و تقریر میں خدا کو گاڈ کے بجائے اللہ کہتے ہیں اسی طرح نبیؐ کو بھی نبی یا رسول کہا کریں۔ اخباری خبر ہے کہ پنجاب کے دو گاؤں میں تین ماہ سے دو مسجدوں میں سپیکروں کے ذریعے جنگ جاری ہے۔ جنگ کی وجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ نبی ہماری طرح بشر تھے۔ دوسرا گروہ اسے توہینِ رسالت سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔ حضورؐ نور تھے۔ آجکل پڑھا لکھا طبقہ حضورؐ کا نام اس طرح لیتا ہے جیسے کسی ہم رتبہ آدمی کا ذکر ہو۔ یعنی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہتا۔ یہ بھی توہینِ رسالت ہے۔ اس

سے پہلے کہ لوگ اس کا اپنا اپنا مطلب لیں حکومت کو اس کی وضاحت کرنی چاہیئے کہ توہینِ رسالت سے کیا مراد ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہنا بھی توہین ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ لوگ اس سے اپنا اپنا مفہوم لیں اور ایک دوسرے کا کام تمام کریں۔ حکومت کو چاہیئے کہ توہین رسالت کی مکمل وضاحت کرے۔

گوھرھائے تابدار

- نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور — موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر (اقبالؒ)
- میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو — نہیں ہے بندۂ حر کے لئے جہاں میں فراغ (اقبالؒ)
- علم میں ترقی صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ معاشی استحکام ہو۔ (ابن خلدون)
- زندگی بغیر محنت کے مصیبت اور بغیر عقل کے حیوانیت ہے۔
- خدا کا ایک قانون یہ ہے کہ غیر متوازن ذہن جس قدر مصروف کار رہیگا اسی قدر اس کا توازن اور بگڑتا جائے گا۔ (مرتبہ: ثریا عندلیب)

گوہرہائے تابدار

- وہ ایمان جو اعمالِ صالحہ کا محرک نہیں بنتا دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے۔
- سزا و جزا کا تصور انسانی کردار کا محاسب بھی ہے اور محافظ بھی۔
- بابا آدم جب کوئی اچھی بات کرتا تھا تو اسے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بات اس سے پہلے کسی نے نہیں کی۔
- قرآن کی رُو سے ختمِ نبوت کی مہر ٹوٹ جاتی ہے اگر کشف و الہام کو مانا جائے۔
- اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اعلان کرے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ ہم تمہاری اور تمہاری اولاد کی روٹی کے ذمہ دار ہیں۔ مرتبہ: ثریا عندلیب)

جانِ عالم

برائے نام

قرآنی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی نبی نے قوم کو خدا کا پیغام دیا تو اسے یہی جواب ملا کہ ہم اپنے آبا و اجداد کی روش چھوڑ کر تمہاری بات کیوں سُنیں۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ ہم نے اپنے آبا و اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سُنی۔ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا۔ جن معبودوں کی پرستش ہمارے آبا و اجداد کیا کرتے تھے تو ہمیں ان کی عبادت سے روکتا ہے؟

یہ وہ اندھی تقلید ہے جو ہر قوم میں چلی آ رہی تھی۔ قرآن ان کے لئے اور کیا کہے گا کہ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ کہ تم اور تمہارے اسلاف کھلی گمراہی میں تھے۔

لیکن کھلی گمراہی کا احساس تو اسے ہو سکتا ہے جسے منزل کی طلب ہو، جسے سفر کی تڑپ ہو۔ جو آنکھیں بند کئے اگلے اندھے کی لکڑی کے سہارے چلا جا رہا ہو اسے غلط اور صحیح راستے کی تمیز کیونکر ہو سکتی ہے؟ آج ہم بھی آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے ہیں اور کوئی دیکھنے والا کہے کہ میں دیکھ رہا ہوں تو نابیناؤں کا شہر اس پہ ٹوٹ پڑتا ہے۔ صدیوں سے متوارث چلی آتی اندھی تقلید نے ہماری فکروں پہ قفل ڈال دئے ہیں۔ ہمیں یہی باور کرایا گیا ہے کہ اسلام فقط نماز پڑھنا ہے، اسلام سنگسار کرنا ہے، ہاتھ کاٹنا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ اسلام محض شرعی سزاؤں کے نفاذ کا نام نہیں۔ اسلام تو وہ پُرامن ماحول ہے جہاں سلامتی قدم چومتی ہے۔ جہاں تیری میری کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ جہاں غور و فکر کرنے والے اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ جہاں ہر بات کو قلب کے مکمل اطمینان سے تسلیم کیا جاتا ہے مگر ہم اس اسلام کے داعی ہی کب ہوتے ہیں۔

ع جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

ہمارے بیشتر علماء دین کی رُوح سے ہمیں دور رکھتے ہیں۔ اسلام کو اپنے سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ "مومن" جو عملِ مسلسل کا نام ہے، نیکیوں کی گنتی میں اُلجھا کر اسے عمل سے دور کیا جا رہا ہے۔ "قرآن"

وحدت کا تصور دیتا ہے اسے فراموش کر کے تفرقہ پھیلایا جا رہا ہے اور ستم بالائے ستم کہ یہ سب کچھ دین کے نام پر ہو رہا ہے۔ ہماری سوچوں کو اس قدر سطحی بنایا جا رہا ہے کہ ہم غور و فکر کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ ہمیں ہمارے جذبات اور ہماری سطحی سوچوں میں الجھایا جا رہا ہے۔ ہم میں تڑپ تو موجود ہے مگر جو از تڑپ سطحی ہے۔

ع رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالیؓ نہ رہی

ہم آج بھی دین کی خاطر وہی تڑپ رکھتے ہیں، ہم آج بھی حضرت حضرت بل کے نام پہ جانیں دیتے ہیں اور کبھی بابری مسجد کی حرمت پہ نذرانہ جاں دیتے ہیں۔ مگر احترام و مقام کی اصل روح کو ہم فراموش کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے خدا کی نصرت ہماری رفیق نہیں ہے۔ اسی لئے آج دنیا کے ہر خطہ میں مسلمان زبوں حال ہے۔ ہمارا عمل ہمارے جذبات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ہم جو کہتے ہیں وہ عملاً کرتے نہیں ہیں۔ ہم حضورؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا زمین پہ رہنا تنگ کر دیتے ہیں۔ ہم ختمِ نبوت کی مہر توڑنے والوں کی جان لینے کے درپے ہوتے ہیں مگر غور کیا جائے تو ہم خود اپنی جاہلیت کی بدولت حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ خود ختمِ نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ اگر ہم خود فریبی کے حصار سے باہر نکل کر سوچیں تو وہی کچھ کر رہے ہیں جس کی پاداش میں دوسروں کو ہم مٹانا چاہتے ہیں۔

ہم قرآن کو آخری، مکمل اور آسمانی کتاب اور حضورؐ کو آخری نبی تو کہتے ہیں مگر ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ وحی، جو خدا سے براہِ راست علم ہے اور جو انبیاء سے مخصوص ہے جس کا سلسلہ حضورؐ کے بعد ختم ہو گیا ہے۔ وہ علم (وحی) اب بھی خدا سے براہِ راست اپنے بندوں کو پہنچ رہا ہے۔ یہاں ہم حضورؐ کی شان میں گستاخی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں ہم ختمِ نبوت کا انکار کر رہے ہوتے ہیں مگر ہمارے علماء نے ہماری سطحی سوچوں کو افیون دینے کے لئے وحی کا نام "الہام" رکھ دیا اور نبی کی جگہ "اولیاء" کہہ دیا کہ کہیں یہ مردہ دل مسلمان چونک نہ جائے نبی سے معجزات منسوب تھے تو انہوں نے غیر نبی سے بھی معجزات منسوب کر دیئے مگر انہیں کرامات کہہ دیا۔

ع جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ان عقائد کا منبع خواہ بڑی معتبر ہستیاں ہوں مگر حقیقتاً یہ وہ بازی گر ہیں جو ہمیں کھلا دھوکا دیتے ہیں۔ یہ جو ہیں وہ ہمیں نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ان بازی گروں نے عقائد کی جذباتی نکیل ہمارے افکار کے نتھنوں میں ڈال رکھی ہے، ان کے پاس فتووں کی چابک ہے۔ مگر یہ جان لیں کہ قرآن اور ختمِ نبوت پہ ایمان رکھنے والے وہ منہ زور گھوڑے ہیں جنہیں عقائد کی لگام یا فتووں کی چابک اپنی تنگ نظری کے اصطبل میں مقید نہیں رکھ سکتی۔

یہ بات ابھی مجھ کو بھی معلوم نہیں ہے
پتھر اِدھر سے آتے ہیں اُدھر کیوں نہیں جاتے

اور جب ہمیں یہ احساس ہو جائے گا تب یہ پیرانِ کلیسا خود ہی کلیسا چھوڑ دیں گے۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

گوہرہائے تابدار

- اندھی عقیدت ٹھوس حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور علم و بصیرت کی روشنی میں آگے نہیں چل سکتی۔
- خانقاہیت جسے روحانیت کہتے ہیں غریب نفس ہے۔
- زندگی تانا اور بانا کے امتزاج کا نام ہے۔ دین اور دنیا کا امتزاج۔ تانا اور بانا اکٹھا کیا جائے تو پھر دین بنتا ہے۔
- مادی دنیا کے اسباب و ذرائع کی ساری قوتیں اور اقدارِ خداوندی کا ملاپ۔ یہ ہے قرآنی زندگی۔

(مرتبہ: ثریا عندلیب)

نامے

جو میرے نام آتے ہیں

۱۔ مکتوب: ڈاکٹر میر مصطفٰے حسین۔ ۷/۲۷۳-۳-۱۰۰ ہمایوں نگر۔ حیدر آباد۔ بھارت۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ گذشتہ سال (مئی ۱۹۹۲ء) میرے کراچی کے قیام کے دوران آپ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور علامہ پرویزؒ کی تصانیف اور قرآنی افکار پر گفتگو بھی ہوتی رہی۔ شاید آپ نے ان لمحات کو RECALL کر لیا ہوگا۔ یہاں بھی الحمد اللہ ایک حلقۂ احباب، خاص کر نوجوانوں پر مشتمل تشکیل پا رہا ہے اور اسی کے ذریعہ پرویزؒ صاحب کی قرآنی افکار پھیل رہی ہیں۔ ہمارا ارادہ اسے ایک مستقل مرکز کی شکل دینے کا ہے اور علامہ کی فکر کو جس قدر بھی ہو سکے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ مختلف طریقوں سے وہاں سے پرویزؒ صاحب کی تصانیف منگوا رہا ہوں۔ کئی لوگ ایسے ہیں جو نہ صرف یہ کتابیں خریدنے کے لئے مشتاق ہیں بلکہ بعض لوگ تو چاہتے ہیں کہ ایک گروپ کی شکل میں لاہور جا کر طلوع اسلام، کا مرکز دیکھیں، متعلقہ اصحاب سے ملیں اور علامہ پرویزؒ کی ساری تصانیف کے جتنے بھی SETS ہو سکے ساتھ لے آئیں۔ فی الحال اس سلسلہ میں سب سے بڑا مسئلہ جو حائل ہے وہ ویزا کا ہے اور یہ ایسا موقف اختیار کر گیا ہے کہ شاید ایسی صورت حال اس سے پہلے کبھی درپیش نہیں رہی۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے کیا اسباب مہیا کرتا ہے۔

آپ حضرات کی کوششیں واقعی قابلِ قدر اور قابلِ تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو ضرور ثمر بار بنائے گا۔ کیونکہ ان پر خلوصِ دل سے عمل آوری ہو رہی ہے۔ میں اپنی حد تک اس بات سے پُر امید ہوں کہ علامہ پرویزؒ نے جو شمع روشن کی ہے اس سے یکے بعد دیگرے کئی شمعیں روشن ہوتی چلی جائیں گی اور یہ روشنی ساری دنیا میں، آہستہ آہستہ ہی سہی پھیلتی چلی جائے گی اور اس طرح دنیا قرآنی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھنے کے موقف میں آ جائے گی۔

○

۲۔ مکتوب: سعید حمید الدین صاحب۔ ۲۳۶/D۔ میلاد پارک بنوں۔

السلام علیکم. میں طلوعِ اسلام کا خریدار ہوں. طلوعِ اسلام مجھے بیحد عزیز ہے. میں اسے پڑھنے کے بعد گرلز ہائر سیکنڈری سکول بھیج دیتا ہوں.

آپ نے پوچھا ہے کہ اگر کوئی مسئلہ لاحق ہو تو بتائیے کہ طلوعِ اسلام کے ممبران اس میں آپ کا ساتھ دیں. میں دو اجتماعی مسئلوں کی طرف آپ کی اور تمام ممبرانِ طلوعِ اسلام کی توجہ مبذول کرانی چاہتا ہوں. ہم یہ کہتے کہتے نہیں تھکتے کہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے. اسلام میں روزمرہ زندگی کے لئے قدم قدم پر رہنمائی موجود ہے. ہم ہر نماز میں یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت دے. جبکہ پاکستانی مسلمان مہذب لوگوں کی طرح اپنے ہاتھ پر سڑک پر نہیں چلتے. جو قوم ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کرے وہ اور کس قانون کی پاسداری کرے گی. پرندے بھی آسمان میں ایک فارمیشن میں پرواز کرتے ہیں. میری ناقص رائے یہ ہے کہ طلوعِ اسلام کے صفحات کے ذریعے قوم میں سڑک پر مہذب طریقے سے چلنے کا شعور پیدا کریں. دوسرا مسئلہ ہوائی فائرنگ کا ہے. اس بے حسی، بے دردی اور خاک اور خون کے کھیل کو ختم کرنے کے لئے اٹھیں اور قوم کو بیدار کریں. طالبِ دعا و دعاگو.

○

۳. مکتوب: جناب معتصم باللہ صاحب.

جنابِ عالی، "کیا پرویز واقعی کوئی کافر تھا؟" پورے بیس برس تک یہ سوال میرے ذہن میں گونجتا رہا. جواب حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی. مگر اللہ کبھی تو کسی کی کوئی خواہش پوری کر دیتا ہے. کوئی ڈیڑھ سال پہلے اچانک میں نے کسی سے سنا کہ ہسپتال میں ڈاکٹر الطاف (چیسٹ سپیشلسٹ) پرویزی ہے. محترم الطاف صاحب کے والدِ محترم جناب صادق صاحب کو رسالہ طلوعِ اسلام ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے مطابق برابر ۴۵ سال سے ملتا رہا ہے. ڈاکٹر صاحب کی کرم نوازی کہ انہوں نے مجھے درجنوں رسالے طلوعِ اسلام کے فراہم کئے اور ساتھ پرویزؒ کے ایک دو کتب بھی مطالعے کے لئے عنایت کئے. مفہوم القرآن پڑھنے کے لئے بھی میں انہی کا ممنون ہوں. دیگر کتابیں میں نے عظیم بک ڈپو پشاور سے خریدی ہیں. سوائے چند ایک کے مثلاً "تحریکِ پاکستان اور پرویز" جو کہ میں قیمت کی وجہ سے خرید نہ سکا ہوں. میرے پاس نہ صرف پرویزؒ صاحب کا "نظامِ ربوبیت" بلکہ جناب نوری صاحب کا بھی موجود ہے. ایڈووکیٹ عبداللہ ثانی صاحب کی کتاب "ابلہ مسجد" جو ایک لاثانی کتاب ہے، بھی میرے پاس موجود ہے. کتابوں میں سے جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد سے لے کر ۱۹۵۴ء تک سینکڑوں سالوں میں گزرنے والے مسلمانوں میں سے پرویزؒ وہ واحد مسلمان عالم تھے جنہوں نے مسلمانوں کو ان کا اصلی معاشی نظام بالکل ٹھوس سائنسی شکل میں پیش کیا ہے.

کتابوں سے میں جو کچھ اخذ نہیں کر سکا ہوں وہ "دو قومی نظریہ" کا منشاء ہے. مگر میرا مقصد نکتہ چینی بھی نہیں ہے

کیونکہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت پرویز کو آس پاس یہ کچھ مسلمان نظر آ گئے ہوں اور تاریخ کو چونکہ مسخ کیا گیا ہے اور سیاسی راز تو سیدھے سادے الفاظ میں بتانے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا حقیقت کو ہمارے نظروں سے اوجھل رکھا گیا ہو۔ لیکن ادھر ہم بھی یک گونہ حق بجانب ہیں کیونکہ قائداعظم کے اردگرد مسلمانوں میں سے تحریک چلانے والے عوام کے پاس اگر قربانی کے لئے کچھ نہیں تھا صرف جان تھی یا عصمت تھی تو اسے قربان کر ڈالا مگر تحریک دلانیوالے خواص میں سے کسی فردِ واحد نے بھی نہ تو مال (جاگیر) کی قربانی دی' نہ جان کی نہ عصمت کی، مگر پھر بھی اقتدار پر ان ہی کو براجمان ہونا تھا' ہو گئے اور ہوتے رہے ہیں۔

○○○

گوہرہائے تابدار

- عقل و خرد سے بیگانگی جہنم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔
- انسان اپنی مرضی کو خدا کے قوانین کے تابع لے آئے تو اس کی مرضی خدا کی مرضی ہو جاتی ہے۔
- قرآن کریم دنیا میں زندگی کی قوتیں سلب کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ زندگی اور قوت کا پیغام بن کر آیا ہے۔
- اسلام اس نظامِ زندگی کا نام ہے کہ جس میں انسان ہر قسم کے خوف و حزن سے محفوظ رہے اور جو کچھ اس نے بننا ہے وہ بن جائے۔

(مرتبہ: ثریا عندلیب)

گوہرہائے تابدار

- دین کی صداقت ثابت کرنے کا طریق یہ ہے کہ اسے عملاً نافذ کر کے دکھاؤ۔
- انسان کا طرزِ فکر ہی اس کی حقیقی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے۔
- اپنی ذات پر ترس کھانا خود رحمی کی نہیں انتہائی خود غرضی کی علامت ہے۔
- اسلام ہی نے وہ بنیادی جذبات اور دفاکیشی فراہم کی جو بکھرے ہوئے انسانوں اور گروہوں کو متحد کرتی ہے۔ (اقبالؒ)

(مرتبہ: ثریا عندلیب)

عمران احمد۔ کالج آف ڈرژری سائنسز

صُبحِ قیامت

تنہائی شب ہے۔ قمر کی چاندنی بھی خاموش اور شجر کی شاخیں بھی خموش۔

تاروں کا کارواں بھی بے درا رواں ہے

چاند، دشت و در، کہسار کے سکوت کا فسوں ہر سو چھایا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے

آغوش میں شب کے سو گئی ہے (بانگِ درا، اقبالؒ)

ہر شے اپنے وجود سے لذت گیر ہے اور مئے نمود سے مست ہے۔

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا

قدرت ہے مراقبے میں گویا (بانگِ درا، اقبالؒ)

لیکن اس حالتِ سکوت میں ایک جانِ ناشکیبا ایسی بھی ہے جو صورتِ گل خاموش اور مانندِ بو پریشان ہے۔ اس دیوانے کو عشق کی آشفتگی نے صحرا کر دیا ہے۔

ہر کیفیت میں نئے جلوے کی آرزو رکھنے والا، دلِ سکون ناآشنا کا مالک، دل میں ہر دم اک نیا محشر بپا رکھنے والا، آتشِ زیرِ پا کا حامل، اجزا کی بجائے کل کا متلاشی اور یہ دلِ برق آشنا رکھنے والا آج کے عہد کا "سلیم" ہے — قلبِ سلیم کا حامل آج کا نوجوان ذہنی طور پر مضطرب اور جذباتی طور پر سخت بے اطمینان ہے۔

اس کے فکر و عمل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی ہے، اس کے ضبط و تحمل کے سارے ضابطے غارت ہو چکے ہیں، اس کے جنوں کی شورش زنداں کے پتھروں سے بھی نہیں سنبھلتی، اس کی سیماب صفتی سے آتش فشاں بھی لرز رہا ہے!!

یہ کس کافر ادا کے جمال کی قہرمانی ہے جس نے اسے لوٹ لیا ہے، یہ کس فتنہ گر حسین کے عشوے اور غمزے ہیں جس سے اس کی متاعِ صبر و قرار لٹ گئی ہے، کون سی چوکھٹ نے اس کی جبینِ نیاز کے سجدے اپنی جانب کھینچ لئے ہیں۔

یہ کس کی فتنہ سامانیاں ہیں کہ اس کی زندگی حشر بداماں ہوگئی ہے، اس کے افکار میں یہ کیسا انقلاب برپا ہے کہ اُس کے سینے میں صبحِ قیامت نمودار ہو رہی ہے، اس کے سکوت کو ہنگام میں کس نے بدلا ہے، ان کی بے پناہ (INTRINSIC ENERGY) کو کون سی منزل ملنے والی ہے۔ اس توانائی سے کون سے قلعے تعمیر ہوں گے اور وہ ستاروں آگے نہ جانے کتنے جہانوں کو تسخیر کریں گے؟

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی (ریاض)

سائنس کی ترقی اور ٹیکنالوجی کے پھیلاؤ نے ہمارے سوچنے سمجھنے کے زاویے بدل دیئے ہیں، طبیعات کے قوانین خاص طور پر قانونِ سبب و مسبّب (CAUSE / EFFECT) نے انسان کو متعدد قدیم توہمات سے نجات دلائی ہے۔ موسمیات نے ضمیاتی اوہام کا خاتمہ کر دیا ہے، ہوائی جہاز، سینما، بے تار برقی سلسلے، ایکس رے، ریڈار، وغیرہ کی ایجاد و دریافت نے انسان کی سوچ کو ایک نئے رُخ پر ڈال دیا ہے۔ لیکن سائنس کی اس حیرت انگیز ترقی نے انسان کو پہلے سے زیادہ مضطرب کر دیا ہے۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی نے صنعتی انقلاب کے ذریعے سابقہ زرعی معاشرے کی مخصوص عمرانی، سیاسی اور معاشرتی اقدار بھی بدل کر رکھ دی ہیں۔ قدم قدم پر تضادات کی خاردار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔

فرائڈ کے خیال میں یہ تضادات تین گوشوں میں نمودار ہوئے۔

(i) انسان اور خارجی کائنات میں تضاد،

(ii) انسان اور دوسرے انسانوں میں باہمی تضاد،

(iii) انسان کی ذات میں متخالف قوتوں کا تضاد،

ان تضادات میں توافق پیدا کرنے کی سعی ہی اضطراب کو جنم دیتی ہے۔

جیلانی کامران اپنی کتاب "اقبال اور ہمارا عہد" میں لکھتے ہیں کہ

"ہماری نئی نسلوں نے جس فکری فضا میں سانس لینے کی ابتدا کی ہے اس میں کثرتوں کے بدلتے ہوئے رشتے کچھ ایسے اُبھرے ہیں کہ ان کے لئے اپنے وجود کو پہچاننا قدرے دشوار ہو رہا ہے اور ایک ایسی صورت پیدا ہوئی ہے جہاں بدلتے ہوئے رشتوں کے حوالے سے وجود کی شناخت کا آغاز ہوا ہے۔ یہ ایک عجیب کیفیت ہے، جیسے کوئی شخص اپنے سمٹے پھیلے سائے سے اپنا قد اور اپنی شخصیت اخذ کر رہا ہو۔"

نئی نسل کے فکری زاویوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں،

"اس عہد میں ہمارے ذہنی اور فکری رویے ہمارے مافی الضمیر سے برآمد نہیں ہوتے بلکہ ان کو مصنوعی طریقوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔"

جیلانی کامران کے تجزیے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ آج کے نوجوان کا وجود ORIGINAL نہیں رہا۔ اس کا ذہن مختلف حصوں میں منقسم ہو کر کثرت کا شکار ہو گیا ہے۔ یہی اضطراب کی وجہ ہے جو انتشار کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
اک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

عہد حاضر کا "سلیم" جب کثرتوں کی حکمرانی والے اس دور میں آنکھ کھولتا ہے، تو وہ اپنی "میں" (EGO) کے قد و قامت میں تبدیلی رونما ہوتا دیکھتا ہے۔ عمر کے اس دور میں رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون اور دماغ کے نہاں خانے میں ایک انقلاب سا رونما ہوتا ہے۔ وہ اپنے وجود کی نفی ہوتے تو دیکھ نہیں سکتا، اس لئے وہ اس راہ عمل کی تلاش میں لگ جاتا ہے جس سے اس کی EGO کی تسکین ہو سکے۔ اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے وہ ہر راہ پر سفر کرنے کو تیار رہتا ہے، ہر باب کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے مستعد ہوتا ہے، اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لئے ہر دشت کی سیاحی میں لگا رہتا ہے۔

اس سفر کی سب سے بڑی صعوبت یہ ہے کہ منزل تک پہنچنے کے نہ صرف راستے بے شمار ہیں بلکہ ہر راستے پر نام نہاد رہبروں کا جم غفیر اپنے پیدائشی حق یعنی جبری رہنمائی کے لئے مستعد رہتا ہے۔

نتیجتاً اس کا اپنا وجود تو ناپید ہو جاتا ہے اور ایک نئے وجود کی پیدائش ہوتی ہے۔ یہ نیا وجود ایسا ہوتا ہے جو تقلید کی روش کا شکار ہوتا ہے، اس نئے کردار کے جسم سے ارادہ چھن جاتا ہے۔ بالغ نظر فلسفی علامہ اقبال نے رموز بے خودی میں "بندگی نامہ" میں ایسے ہی وجود پر تنقید کی ہے جس سے قوت ارادی چھن گئی ہے۔

نوجوان کے لئے سب سے اولین منبع رہنمائی اس کے والدین ہوتے ہیں۔ ہمارے آج کے معاشرے میں زندگی کی تمام آسائشیں چند افراد کے تصرف میں ہیں۔ طبقاتی نظام میں پسے ہوئے والدین کے پاس اتنی فرصت ہی کہاں کہ وہ اپنی اولاد کے لئے ایک نمونہ بن سکیں۔ معاشی کے چکر میں بندھے ہوئے لوگوں کے اخلاقی رویے بھی ان کی معاشی حالت کا عکس ہی ہوتے ہیں۔ دوسرا (SOURCE OF INSPIRATION) اساتذہ ہوتے ہیں۔

اگر میر حسن اور آرنلڈ جیسے اساتذہ کی رہنمائی میسر ہو تو کئی اقبال، علامہ سر ڈاکٹر اقبالؒ کے رستے پر فائز کئے جا سکتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ آج کے تعلیمی نظام کی یہ حالت ہے کہ وہ شاہین بچوں کو خاکبازی کا درس دے رہا ہے۔

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

مغربی تہذیب و تمدن سے مرعوب چند تعلیمی ادارے اگر کچھ EDUCATIONAL STATUS رکھتے بھی ہیں تو ان کی تعلیم نوجوانوں کو الحاد کی طرف مائل کئے جا رہی ہے۔

ہمارے موجودہ معاشرہ میں اہلِ مذہب اور علمائے کرام بڑی مؤثر INFLUENCIAL حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ وہ اپنے مؤثر مقام کو استعمال کر کے پوری قوم کی زندگی کا دھارا بدل سکتے ہیں لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان کی نظر سے اسلام کا DYNAMIC پہلو چھپا ہوا ہے۔ دین کو بہ حیثیت کل سمجھنا اور عوامۃ النّاس کو سمجھانا ان کے فرائض میں نہیں رہتا۔ فقہی اور مسلکی موشگافیوں کو مکمل دین قرار دے دیا گیا ہے — قرآن کا نورِ بصیرت عام کرنے کی بجائے اپنی فقہی کتب کے مطالعہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مذہبی مدرسوں میں مروّجہ نظامِ تعلیم اس عہد کے تقاضوں کو بالکل پورا نہیں کرتا۔

اہلِ فقہ کے ہاں ظاہر پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ کسی ایک کو صرف اس وجہ سے ملعون ٹھہرایا جاتا ہے کہ وہ شلوار کو ٹخنوں سے اوپر نہیں کرتا، کہیں آمین آہستہ یا اونچی کہنے پر جھگڑا ہے۔

اہلِ تصوّف کے ہاں پیری و فقیری کا نام نہاد سلسلہ قائم ہو چکا ہے جس کا دین کی اصل سے کوئی تعلق نہیں۔ تصوّف کے یہ حسین مرغزار مستقبل کے تقاضوں سے بالکل بے خبر کر دیتے ہیں۔ دل سے یہی پکار نکلتی ہے۔

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ — کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

واصف علی واصف اپنی تصنیف "دل دریا سمندر" میں لکھتے ہیں کہ آج کا یہ اضطراب اس لئے ہے کہ زندگی کو تقویت دینے والے ادارے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک نئے جہاں کے پیدا ہونے کی بشارت بھی رکھتا ہے۔ آج کا اضطراب کسی وقت کروٹ لے سکتا ہے۔ یہ اضطراب بھولا ہوا سبق، چھوڑی ہوئی منزل اور نظر انداز کئے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے اور اس طرح سے پیدا ہونے والا احساس غفلت بیداری کی اوّلین کرن ہے۔

نوجوان مسلم کے قلب و نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی سب سے زیادہ فکر علامہ اقبالؒ کو تھی۔ یہ اسی صورت ممکن ہے کہ جب وہ اپنی خودی سے آگاہ ہو جائیں۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

انفرادی اضطراب کو اجتماعی فکر و عمل کے سانچے میں ڈھال لینے والا قوم کا راہنما ہوتا ہے، میر کارواں ہوتا ہے۔ اقبالؒ کی شب بیداری اور اختر شماری اس کام کے لئے وقف تھی۔ اقبالؒ کی بانگ درا نے نوجوان مسلم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔

ے
کبھی اے نوجوان مُسلم تدبّر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا ہے تُو ٹوٹا ہوا تارا

اقبالؒ نے نوجوان مسلم کو یقین کا درس دیا اور اپنی خودی کے استحکام پر زور دیا۔

ے
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

ے
یقیں پیدا کر کہ اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ضرورت اس امر کی ہے نوجوان محض کتاب خواں نہ بنیں بلکہ صاحبِ کتاب بنیں، اپنی ذات کا ادراک کریں اور تیقین کی قوت سے بہرہ ور ہوں۔ ان کے سینے میں وہ اضطراب رونما ہو چکا ہے، وہ طوفان برپا ہو چکا ہے جس کے بحر کی موجیں ساحلِ مراد سے سر پٹک رہی ہیں۔ آج کے اضطراب کو چینل درکار ہے، اک رہبر جو دیوانگی کو فرزانگی میں بدل دے۔

ٹمٹماتے ہوئے مضطرب چراغ اکٹھے کر دیئے جائیں تو ایک عظیم چراغاں ہو سکتا ہے۔ ورنہ چراغوں کے بجھ جانے کا اندیشہ ہے

ہر مسافرِ شب اپنا چراغ خود بن جائے اور اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی کرنے کی سعی میں لگا رہے تو گوہر مقصود اللہ کی رحمت سے ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔

ے
یہ رات اپنے سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کر لے
میں تیرگی کا غبار بن کر نہیں جیوں گا
مجھے پتہ ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں کٹے گی
مجھے خبر ہے کہ میری بے زور ٹکروں سے
فصیلِ دہشت نہیں ہٹے گی
میں جانتا ہوں کہ میرا شعلہ چمک کے رزقِ غبار ہوگا
تو بے خبر یہ دیار ہوگا

انفرادی اضطراب کو اجتماعی فکر و عمل کے سانچے میں ڈھالنے والا قوم کا راہنما ہوتا ہے، میر کارواں ہوتا ہے۔ اقبالؒ کی شب بیداری اور اختر شماری اس کام کے لئے وقف تھی۔ اقبالؒ کی بانگ درا نے نوجوان مسلم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔

؎ کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا ہے تُو ٹوٹا ہوا تارا

اقبالؒ نے نوجوان مسلم کو یقین کا درس دیا اور اپنی خودی کے استحکام پر زور دیا۔

؎ خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

؎ یقیں پیدا کر کہ اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ضرورت اس امر کی ہے نوجوان محض کتاب خواں نہ بنیں بلکہ صاحبِ کتاب بنیں، اپنی ذات کا ادراک کریں اور تیقین کی قوت سے بہرہ ور ہوں۔ ان کے سینے میں وہ اضطراب رونما ہو چکا ہے، وہ طوفان برپا ہو چکا ہے جس کے بحر کی موجیں ساحلِ مراد سے سر پٹک رہی ہیں۔ آج کے اضطراب کو چینل درکار ہے، اک رہبر جو دیوانگی کو فرزانگی میں بدل دے۔

ٹمٹماتے ہوئے مضطرب چراغ اکٹھے کر دیئے جائیں تو ایک عظیم چراغاں ہو سکتا ہے۔ ورنہ چراغوں کے بجھ جانے کا اندیشہ ہے

ہر مسافرِ شب اپنا چراغ خود بن جائے اور اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی کرنے کی سعی میں لگا رہے تو گوہرِ مقصد اللہ کی رحمت سے ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔

؎ یہ رات اپنے سیاہ پنجوں کو جس قدر بھی دراز کر لے
میں تیرگی کا غبار بن کر نہیں جیوں گا
مجھے پتہ ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں کٹے گی
مجھے خبر ہے کہ میری بے زور ٹکروں سے
فصیلِ دہشت نہیں ہٹے گی
میں جانتا ہوں کہ میرا شعلہ چمک کے رزقِ غبار ہوگا
تو بے خبر یہ دیار ہوگا

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

قرض

زندگی میں ہر شخص پر کبھی نہ کبھی ایسا وقت آجاتا ہے جب اس کی کوئی ضرورت رُک جاتی ہے اور اسے دوسروں کی امداد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس امداد کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس کے پاس ضرورت

قرض کسے کہتے ہیں

کی چیز فالتو ہو تو وہ اسے ضرورت مند کو ویسے ہی دے دے (یہ احسان کی شکل ہوگی)۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ چیز (یا اس کے خریدنے کے لئے روپیہ) واپسی کی شرط کے ساتھ دیا جائے، اسے قرض کہتے ہیں۔ قرض کا معاملہ ہمیشہ تحریر میں لے آنا چاہیئے (لکھ لینا چاہیئے)، قرآنِ کریم میں ہے۔

اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ ط

"جب تم کسی کو ایک مقررہ مدت کے لئے قرض دو تو اسے لکھ لیا کرو۔"

رہن

اور اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ لکھنا ممکن نہ ہو تو قرض دینے والا، قرض لینے والے کی کوئی چیز بطور ضمانت اپنے پاس رکھ لے، اسے رہن رکھنا

کہتے ہیں۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ (۲/۲۸۳)

"اور اگر تم سفر میں ہو اور قرض کا معاملہ لکھنے والا نہ ملے تو کوئی چیز بطور ضمانت اپنے قبضہ میں رکھ لیا کرو۔"

ادائیگی کا وعدہ

قرض کی ادائیگی کے لئے جو وعدہ کیا جائے اسے پورا کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ جس نے قرض لیا ہے اس پر تنگی آجائے تو قرض دینے والے کو چاہیئے کہ قرضہ کی واپسی کے لئے اسے سہولت دے۔

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (۲/۲۸۰)

اور اگر اس پر تنگی آجائے تو اسے اس وقت تک کی مہلت دے دینی چاہیئے جب وہ اسے آسانی سے ادا کر سکے اور اگر تم قرضہ بالکل معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔"

سود

لیکن جس قدر روپیہ قرض دیا ہے اس سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں لینا چاہیئے۔ اس زیادتی کو سود (یا ربٰو) کہتے ہیں جو حرام ہے۔

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)

"اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام ٹھہرایا ہے۔"

جب قرضے کی ضمانت کے طور پر کسی چیز کو رہن رکھا جائے تو ایسی چیز (مثلاً مکان یا زمین وغیرہ) کی آمدنی کھانا بھی جائز نہیں، وہ بھی ربٰو میں داخل ہے۔

طلوع اسلام لاہور

طلوع اسلام لاہور

علامہ غلام احمد پرویزؒ

کا درسِ قرآنِ کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
۱۔ ایبٹ آباد	۵۹۵ کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	جمعۃ المبارک	۱۰ بجے صبح
۲۔ بورے والا	بر مکان محمد اسلم صابر، مرضی پورہ گلی نمبر ۵۔ رابطہ فون: ۲۴۳۸	ہر ماہ پہلا تیسرا جمعہ	۹ بجے صبح
۳۔ پشاور	دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ، کابلی بازار۔ رابطہ: ۲۷۰۷۳۲	ہر بدھ و جمعہ	۵ بجے شام
۴۔ پشاور	بر مکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	۴ بجے شام
۵۔ پیر محل	مکان نمبر ۱۳۹/۱۴۰۔ مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹ بجے صبح
۶۔ پنج کسی	بر مطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	۳ بجے سہ پہر
۷۔ جہلم	بر مکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد، جی۔ ٹی روڈ	جمعہ المبارک	۶ بجے شام
۸۔ جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	۱۰ بجے صبح
۹۔ چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر کھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	۳ بجے بعد نماز جمعہ
۱۰۔ چک ۲۱۵ ای۔ بی	بر مکان چوہدری عبدالحمید	//	۸ بجے صبح
۱۱۔ حیدر آباد	گولڈن سینٹری، عثمان آباد	//	۱۰ بجے صبح
۱۲۔ رجانہ	بر مکان چوہدری الیس۔ ایم صادق، مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰ بجے صبح
۱۳۔ سرگودھا	۶۰۔ اے سول لائنز ریلوے روڈ۔ رابطہ فون: ۷۲۰۰۸۳	جمعۃ المبارک	۹ بجے صبح
۱۴۔ سیالکوٹ	محمد افضل خلجی، ایبٹ روڈ۔ رابطہ فون: ۸۷۶۵۸	پہلا اور دوسرا جمعہ	۱۰ بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
۱۵۔ فیصل آباد	۲۳۔ سی پیپلز کالونی [illegible] رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک فون ۴۲۰۵۵	ہر جمعہ	۳۰۔۳ بجے شام
۱۶۔ فیصل آباد	ڈاکٹر طارق محمود [illegible] ۵/۱۳۵ سول کوارٹرز غلام محمد آباد۔ رابطہ فون: ۳۳۰۰۰، ۶۸۰۸۳۵	〃	۳۰۔۳ بجے شام
۱۷۔ کوئٹہ	صابر محمود قلندری توغی روڈ	جمعۃ المبارک	۴ بجے سہ پہر
۱۸۔ کراچی	سٹوڈنٹس کمرشل کمپلیکس، فرسٹ فلور، شاہراہ فیصل (نزد [illegible]) فون: ۵۷۲۲۵۱ ـ ۵۴۷۳۲۹	〃	۳۰۔۹ بجے صبح
۱۹۔ کراچی	مکان ۹ گلشن مارکیٹ، ۳۶/C ایریا کورنگی ۵ رابطہ: محمد سرور فون: ۳۱۲۶۳۱	〃	۳۰۔۱۱ بجے صبح
۲۰۔ کراچی	مکان ۲۸۲۔ E قصبہ کالونی نزد لودھی ہاؤس رابطہ: ڈاکٹر اسلم نوید۔ فون: ۶۶۶۰۵۷۸	〃	۴ بجے سہ پہر
۲۱۔ کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ ایاز حسین انصاری رابطہ فون: ۴۵۷۱۹۱۹	〃	۱۰ بجے صبح
۲۲۔ کراچی	مکان ۱۲۰۶۔ گلی ۱۰۔ اے، بی ۳۶، شریف کالونی۔ لانڈھی رابطہ: لطیف، فون: ۳۱۰۳۱۶	اتوار	۸ بجے شب
۲۳۔ کوہاٹ	بر مکان شیر محمد، نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	۸ بجے صبح
۲۴۔ گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	〃	بعد از نماز جمعہ
۲۵۔ گجرات	مرزا ہسپتال، کچہری روڈ	جمعرات	۳ بجے
۲۶۔ لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹ بجے
۲۷۔ لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	〃	بعد نماز مغرب
۲۸۔ ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ		۱۰ بجے صبح
۲۹۔ جوہر آباد	بر مکان حکیم فاروق شاہ قاضی کالونی	〃	بعد نماز جمعہ
۳۰۔ ماموں کانجن	بر مکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک ۵۰۹ گ ب	〃	〃
۳۱۔ ڈی۔جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج، بلاک ۲۔ کچہری روڈ	〃	۳ بجے سہ پہر
۳۲۔ راولپنڈی	بر مکان ملک فضل کریم ۳۰ ملت کالونی لکھا سنگھ سٹیٹ۔ رابطہ: چوہدری نثار احمد، بائی وے آٹو گوال منڈی، فون ۷۴۷۵۲	〃	۳۰۔۲ بجے شام

2. The concept of love.

The most effective law of success which makes all victories possible is Love. Iqbal gives to this word a very wide meaning. It is for him the regenerating principle of the universe, the very measure of man.

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُتکدۂ تصوّرات

Love is the perceptor of the intellect, the heart and the vision:

If there is no love, religion and its precepts are nothing but an idol-house of vain imaginings.(2)

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو

Old schisms, whom wisdom cannot sew or stich. Love knits those sans needle and stich.(3)

یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی!

When the spirit of love has no place in any thought or action, all wisdom and learning is vain trick and pretence.(4)

If you want to succeed in achieving your aims, the first thing to do, he says, is to learn the subject of love in general, and you might as well find a perfect teacher who can teach theory and practice of the subject of love.

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

Transmute your handful of earth into gold:

Kiss the threshold of an expert advisor.(1)

1. The Secrets of the Self, p.8.
2. Bal-i-Jibril.P 112
3. Armaghan-i-Hijaz.p.37
4. Bal-i-Jibril, p.146

(To continue - Next The concept of th e Self.'

I Q B A L

By
M.H.RAZI

1. The Principles of Success.

Success is the fulfilment (of a person's desires, ambitions and ideals.) Although the goals of different people are different, the principles involved for reaching them are the same.

Every verse I have written, Iqbal says, is only to help people accomplish their desires and to make them succeed in their chosen skills, professions and enterprises, as well as in their relationships with others and in achieving health, happiness, wisdom, riches - indeed every conceivable object of their ambitions. He earnestly invites people to study his poetry in order to learn the secrets of all kinds of success. He says:-

سرِّ عیشِ جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا
پیرِ گردوں با من ایں اسرار گفت
از ندیماں راز ہا نتواں نہفت

Come, if you would like to know the secret of everlasting successful life.

Come, if you would like to be successful in every way in the present and in the future,

Heaven taught me these principles,

I cannot hide them from the people. (1)

Iqbal has not given us any complietely systematic, consistent and closely-knit form of his principles of success, but if sufficient and careful attention is given to an elucidation of his philosophical thought and the working out of its practical implications, you can find them, either clearly stated or implied appealing to nature.

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Ghulam Ahmed Parwez (r).

(BOOKS OF ALLAMA GHULAM AHMED PA RWEZ AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THESE PLACES)

1. **BIRMINGHAM**
   229 Allum Rock Road
   Birmingham
   On every Sun at 15.00 hrs.

2. **CANADA**
   716 The west Mall, Etobicock, ONT
   Phone (416)245-5322
   On 1st Sun at 11.00 hrs.

3. **DENMARK**
   Julius Valentiners 25, 2.th.
   2000 Frederiksberg V
   Ph. 38346534
   On last Sat at 19.00 hrs.

4. **ESSEX**
   50 Arlington Road, Southend-on-Sea, Essex SS2 4UW
   Phone: 0702-618819
   On 2nd Sun at 15.00 hrs.

5. **KUWAIT**
   Residence Ubaid-Ur-Rahman Arain
   Ph.5316273
   On every Fri at 18.15 hrs.

6. **LONDON**
   76 Park Road, Illford Essex
   Phone: 081-553-1896
   On 1st Sun at 14.30 hrs.

7. **NORWAY**
   Akeberg Veien-56, Olso 6
   Galgeberg, 4th floor.
   On 1st Sun at 16.00 hrs.

8. **YARDLEY**
   633 Church Road, Yardley,
   Birmingham B33 8HA
   Phone 021-628-3718
   On last Sun at 14.00 hrs.

9. **YORKSHIRE**
   Cardigan Community Centre
   145-49 Cardigan Road Leeds-6
   Phone 0532-306140
   On 1st Sun at 15.00 hrs.